ماہنامہ
طلوعِ اسلام
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
لاہور
ستمبر 2013ء

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے' ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر' الاسماء الحسنٰی کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنٰی خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص وصفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات واقدارِ خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے' جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار واحکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر' اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے' انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں' اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود' سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند، منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل، انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہرحال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر، باہم گر متضاد بھی ہیں۔مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ان صفات کا اظہار، انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آ جاتا ہے۔اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مجلّہ طلوعِ اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بینک اکاؤنٹ نمبر 7-3082، نیشنل بینک آف پاکستان،
مین مارکیٹ گلبرگ برانچ کوڈ (0465) لاہور

ستمبر 2013ء | جلد 66 | شمارہ نمبر 9

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

انتظامیہ
قائم مقام چیئرمین وناشر
محمد اکرم راٹھور

مدیر انتظامی
محمد سلیم اختر

قانونی مشیر
ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

بیرونِ ملک
2300 روپے
کینیڈا، امریکہ، آسٹریلیا
2500 روپے

25-B, Gulberg 2, Lahore-54660, Pakistan
Phone: 35714546 Fax: 35764484
Email: idara@toluislam.com
Web Site: http://www.toluislam.com/

قیمت فی پرچہ
30/- روپے
بدل اشتراک سالانہ
350/- روپے

ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف ہوتی ہے۔

پرنٹرز: اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز، 364۔ عمر پارک، لاہور

Naveed Graphic 5.5x8 1c

فہرست

لمعات: آخری اپیل	ادارہ	4
سیلاب کی تباہ کاریاں اور اس کا سدِّباب	غلام احمد پرویز	5
دین کی تبدیلی، مذہب میں	منظور حسین لیل۔ بھکر	26
نظریۂ ارتقاء	راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)	33
الملا الاعلیٰ	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	44

ENGLISH SECTION

Surah Al-Muzammil – Durus-al-Qur'an By G. A. Parwez
Parah 29: Chapter 16 (Translated by: Dr. Mansoor Alam) 53

طلوعِ اسلام کا لٹریچر یہاں سے دستیاب ہے

نیچے درج کئے گئے کتب خانوں سے طلوع اسلام ٹرسٹ کی تمام کتب، دروس القرآن کی تمام جلدیں، اسلامی کتابیں اور لائبریری کے لئے تمام موضوعات پر ہمہ قسم کتب رعایتی نرخوں پر خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔

1- کلاسک بک سیلرز، 42، دی مال (ریگل چوک)، لاہور۔ فون: 042-37312977، موبائل: 0300-4442226	
2- البلال بک ڈپو، اردو بازار، کراچی۔ موبائل: 0344-2502141	3- شہباز بک ایجنسی، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32632664
4- مذہبی کتب خانہ، اردو بازار، کراچی۔ موبائل: 0331-2716587	5- شاہ زیب انٹر پرائزز، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32214259
6- علمی کتاب گھر، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32628939	7- مکتبہ دارالسلام، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32212269
8- مکتبۂ دارالقرآن، اردو بازار، کراچی۔	9- محمد علی، کارخانہ اسلامی کتب، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32631056
	10- ایوانِ کتب، اردو بازار، لاہور، فون: 0321-8836932

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

آخری اپیل

(ستمبر 2013ء کے لمعات پرویز صاحب کے ان الفاظ پر مشتمل ہیں جو انہوں نے 1961ء کے کنونشن میں اپنے خطاب کے دوران آخری اپیل کے طور پر ارزانی فرمائے تھے۔ ادارہ)

آخر میں، میں اپنی اُس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دہراؤں گا، جسے میں ہر سال آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ

1) اپنے ذہن میں کسی غیر قرآنی تصور و خیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

2) اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرو کہ قرآن کی تعلیم انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتی ہے۔

3) قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو۔ لیکن جو کچھ کرو خالصتہً لوجہ اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

4) آپ سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ پرستی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے قطعاً نہ الجھنے دو۔

5) اپنے وقت اور توانائی کو ضدی طبقے کے ساتھ بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرو۔ قرآنی تعلیم کو صرف اُن لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم و بصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

6) ہر رات سونے سے پہلے یہ سوچو کہ آپ نے:

(i) دن بھر میں قرآنی احکام و تعلیم کے خلاف تو کوئی کام نہیں کیا۔ اور

(ii) آپ نے کسی دُکھی انسان کو سکھ پہنچانے کے لئے کیا کیا ہے۔ یاد رکھئے! انسانیت کی بے لوث خدمت، بلند ترین مقصد زندگی ہے۔

7) اور آپس میں محبت اور پیار اور مودّت و الفت کے ساتھ رہو، کہ دنیا میں قرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے اور آپ کے عزائم کو کامیابی عطا فرمائے۔

والسلام!

پرویز

بحوالہ: ''مژدۂ صبح'' خطاب بنام اراکین بزم ہائے طلوعِ اسلام 1961ء

☆.....☆.....☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ یونس پانچواں باب (آیات 18 تا 23)

(یہ تحریر پرویز صاحب کے ایک درس قرآن کی مستوید ہے جو کہ اگست 1973ء میں دیا گیا۔ ان دنوں پاکستان میں سیلاب آیا ہوا تھا جس کے باعث یہ درس سیلاب کی تباہ کاریوں کے موضوع کی نذر ہو گیا۔ اس درس کی مستوید کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ نصف صدی سے ہم ایک طرح کے ''جحیم'' میں اٹکے ہوئے ہیں۔ آپ کے لئے حاضرِ خدمت ہے۔ مدیر)

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

1973ء میں پاکستان کی تاریخ کے ایک تباہ کن سیلاب پر علامہ پرویز کی دل گرفتگی

عزیزانِ من! آج اگست 1973ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 18 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔

(10:18)

لیکن آج میری صورت یہ ہے کہ سینے میں جذبات کا اتنا تلاطم ہے کہ اس میں میں دیکھتا ہوں کہ فکر کے پاؤں کہیں ٹکنے ہی نہیں پا رہے۔ میں طبعاً کافی سہار اور برداشت کا انسان ہوں' ذاتی حوادث اور مصائب کا تو کبھی میں ذکر نہیں کیا کرتا۔ اجتماعی اور ملی حوادث کی کیفیت یہ' 12-1911 میں ورلڈ وار ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں عمر میری چھوٹی سی تھی لیکن احساسات اسی وقت سے بیدار ہو چکے تھے۔ وہاں سے یہ جو اس ملتِ مرحومہ پر حوادث کی یلغار دیکھنی شروع کی تو گویا ساٹھ برس ہو گئے اس واقعہ کو۔ مسلسل اور پیہم اسے انہی آفات کا شکار پایا۔ یہ دور ہی وہ ہے جس میں سے ہم گذر رہے ہیں کہ اس امت پر تو خوشیوں کا دن شاید ہی کوئی آتا ہو اس کی تو عید بھی غم میں گذرتی ہے۔ لیکن ان چیزوں کو برداشت کیے چلا آ رہا تھا۔ گذشتہ دو سال سے جو کچھ ہم پر بیت رہی ہے وہ ایسا تھا کہ اس کا ایک مجموعی تاثر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتا چلا گیا۔ یہ مملکت جیسا کہ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں میرے ایمان کے تقاضے کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ آدھی مملکت چلی گئی' باقی آدھا حصہ جو ملک کا رہ گیا اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جا سکے کہ اس حصۂ ملک میں بھی شاید ہی کوئی فرد ہوگا جو اطمینان کی نیند سو سکتا ہو۔ یہ آج کی حالت ہے اور مستقبل اس سے بھی تاریک تر نظر آتا ہے۔ لیکن وہ جو اس نے کہا تھا کہ

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یہ مرگِ ناگہانی اس سیلاب کی شکل میں ہم پر مسلط ہوگئی۔ ایسا عالمگیر سیلاب کہتے ہیں تاریخ میں کہیں اِدھر نہیں آیا۔ آگ سے بھی تباہی ہوتی ہے لیکن آگ سے تو اس کے رخ سے ذرا پیچھے انسان ہٹ جائے تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ زلزلے کی تباہی بڑی ہی شدید ہوتی ہے لیکن وہ ایک مقام کی تباہی ہوتی ہے۔ اس تباہی کی تو کیفیت یہ ہے کہ یوں کہیے کہ جہاں سے مغربی پاکستان کا میدانی علاقہ شروع ہوتا ہے وہاں سے لے کے جہاں یہ علاقہ ختم ہوتا ہے میدانی علاقہ دریاؤں کے پاس کو کہا جاتا ہے۔ سارا ملک پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ہر صبح جو نئی خبریں آتی ہیں وہ پہلی خبروں سے بھی زیادہ اندوہ ناک اور افسردہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ ابھی کچھ اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اس تباہی کی شدت اور وسعت کتنی زیادہ ہے۔ لیکن ایک چیز جس سے میرے ان زخموں پر نمک چھڑکا جاتا ہے وہ اور ہے۔ ان علاقوں کے لوگ تباہ اور برباد ہو رہے ہیں بے کس بے بس مجبور۔ اور ان کے متعلق کہا یہ جا رہا ہے کہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا مل رہی ہے' یوں ان گناہوں کی پاداش میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ دنیا تو ان کی یوں تباہ ہوئی تھی اور ان مرنے والوں کے کان میں اگر آخری لفظ یہ ڈالا جائے کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے تمہارے گناہوں کے بدلے میں ہو رہا ہے گویا بڑے ہی گناہگار تھے تم جس کی وجہ سے یہ سزا پا رہے ہو۔ سوچو تو سہی کہ ان کے اوپر کیا بیتتی ہوگی یہ سن کر۔ کوئی نہیں اتنا یہ سوچتا کہ کیا یہ سارے گناہ شکر گڑھ سیالکوٹ سے لے کے اور درمیانی علاقے لاہور سے جو اس پار شاہدرہ پھر شرق پور شیخوپورہ اور یوں گذرتے ہوئے آگے پھر سکھر اور دادو اور یہ۔ سارے ملک کے گناہ جو تھے وہ سمٹ کے ان علاقوں کے لوگوں کے حصے میں آئے تھے۔ راوی کے اس پار شاہدرہ والے جتنے تھے سارے فاسق اور فاجر اور ہم بڑے متقی اور پرہیزگار۔ کیونکہ ان پر تو یہ عذاب آیا ہم پر تو عذاب یہ نہیں آیا۔ سوچئے ذرا کہ یہ بات کہاں پہنچتی ہے ان پر کیا بیتتی ہے جن سے یہ کہا جاتا ہے۔ کیا فرق ہے ان میں اور ہم میں۔ وہ راوی اگر اپنا رخ شرق پور اور شیخوپورہ کی طرف نہ کر لیتا اور ادھر (لاہور) کا بند ٹوٹ جاتا ہم بھی اسی عذاب کے اندر مبتلا ہو جاتے۔ تو آج جو ہم بچے ہوئے ہیں تو کیا ہم اپنی نیکیوں کی وجہ سے بچے ہوئے ہیں؟ اور وہ جو تباہ ہوئے ہیں وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے تباہ ہوئے ہیں؟۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ چیز کیا ہے۔ ٹھیک ہے الفاظ تو یہ استعمال ہوتے ہیں ان کے مفہوم غلط ہیں۔ اور اس میں ایک سازش ہے۔ یہ طبعی حوادث ارضی اور سماوی یہ زمین کے رہنے والوں کے گناہوں کی وجہ سے نہیں آتے۔ یہ طبعی قوانین ہیں فطرت کے' یہ ان کے مطابق سب کچھ رونما ہوتا ہے۔ سیلاب کیا ہے۔ عام Average اور اوسط سے زیادہ بارشیں خاص علاقے میں ہوئیں اوپر کا علاقہ جنہیں کہا جاتا ہے' وہ پانی حدِ اعتدال سے بڑھ گیا' دریاؤں کے سواحل میں اس کی سمائی نہ ہوئی وہ پھر کر ادھر اُدھر پھیل گیا۔ یہی ہے نا جسے سیلاب کہا جاتا ہے۔ اس میں ان گناہوں کا کیا دخل ہے۔

باشعور قومیں اس قسم کی تباہ کاریوں کا علاج طبعی قانون کے تحت کرتی ہیں

دنیا کے جن ممالک نے ان چیزوں کا انتظام کر رکھا ہے ان کے ہاں بارشیں برستی ہیں سیلاب بھی آتے ہیں۔ ابھی میں عرض کرونگا

تباہیاں نہیں آتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہالینڈ کا ملک سطحِ سمندر سے نیچے ہے' سمندر کے ساتھ واقع ہوا ہے اس کی سطح سے نیچے ہے۔ سمندر کی' کسی جھیل کی دریا کی نہیں۔ انہوں نے بند باندھا ہوا ہے انہوں نے زمین ہی اپنی سمندر سے کھینچ کے لی تھی۔ سوچئے تو سہی کہ اس قسم کے بند کے نیچے جو زندگی گذار رہے ہوں کس قدر خطرہ مول لے رکھا ہے۔ لیکن ایک قطرہ پانی کا اس میں سے نہیں ٹپکتا۔ یہ نہیں کہ ہالینڈ کے رہنے والے ہماری اصطلاح کے مطابق بڑے نیک واقع ہوئے ہیں۔ طبعی حوادث' ان حوادث کے متعلق تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ (سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا) یہ شے کیا ہے' یہ بارش اور بارش کا پانی' وہ تو کہتا ہے کہ ارض وسما کے اندر یہ نظام جو ہے اس کے اندر جتنی قوتیں ہیں ہم نے انسان کے تابع فرمان کر رکھا ہے ان کو' مسخر کر رکھا ہے اپنے قانون کی زنجیروں میں۔ جو قوم بھی ان قوانین کا علم رکھتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرتی ہے یہ پانی یہ ہوائیں یہ جھکڑ یہ زلزلے یہ آندھیاں یہ سارے مسخر ہوتے ہیں۔ جاپان کی سرزمین' ہر آئے دن وہاں زلزلے آتے تھے۔ زمین کے نیچے جو زلزلہ آتا ہے اس پہ تو اختیار نہیں تھا۔ زمین کے اوپر تباہی مچتی تھی نا۔ مدت العمر وہ تجربے کرتے رہے اور سوچتے رہے اور اس کے بعد ایسے مکانات انہوں نے ایجاد کر لیے کہ زلزلے آتے ہیں اور کوئی مکان گرتا ہی نہیں۔ وہ ان لوگوں کے مقابل میں زیادہ نیک نہیں ہیں کہ جن کے ہاں زلزلے تباہیاں اب بھی مچا رہے ہیں۔ جسے تباہی کہا جاتا ہے وہ ہوتی کیا ہے۔ یہی سیلاب کا پانی جہاں سے آیا تھا وہ پہاڑوں سے گذرتا میدانوں سے گذرتا جنگلوں سے گذرتا لیکن ان علاقوں سے گذرتا جن میں کوئی انسان نہیں بستا تھا۔ تو گذر کے راستے اپنے راستے پہ چلتا اور چلتا چلتا سمندر میں جا گرتا' یہ تباہی تو ایک طرف رہی کسی ایک فرد کو بھی یہ ہلاک نہ کر سکتا۔

قدرت نے تو کائناتی قوتوں کو انسان کے لیے مسخر کر رکھا ہے

تباہی اس وقت کہی جاتی ہے جب اس کی زد میں انسان آتا ہے۔ اور انسان وہ اس کی زد میں آتا ہے جس کے پاس حفاظتی تدبیر نہیں ہوتی۔ اسی کو تباہی کہتے ہیں نا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سیلاب کی تباہی تمام تباہیوں سے زیادہ عالمگیر اور شدید ہے۔ اور اسی لیے قرآنِ کریم نے جن تباہیوں کا ذکر کیا ہے اس میں سب سے پہلے طوفان ہی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس طوفان سے بچنے کی تدبیر کیا بتائی۔ حضرتِ نوحؑ اور ان کے ساتھی جو تھے ان کے مومن اور نیک ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ محض نیک ہونا اگر ان طوفانوں سے بچا سکتا تو انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کہا یہ گیا حضرتِ نوحؑ پیغمبر سے کہ طوفان آنے والا ہے کشتی بناؤ اس سے بچ جاؤ گے۔ ایک پیغمبر اور اس کی اولیں امت جو ایمان اور عملِ صالح کے مجسمے ہوتے ہیں وہ بھی اگر اس حادثے سے اس طوفان سے بچے ہیں حفاظتی تدبیر کی رو سے بچے ہیں۔ حفاظتی تدابیر نہ ہوں تو یہ تباہیاں لاتے ہیں حوادث' حفاظتی تدابیر موجود ہوں تو یہ کوئی تباہی نہیں لاتے۔ قرآن نے یہ واقعہ ذکر کر کے بتا دیا ہمیں کہ یہ حوادث آتے رہیں گے ان سے بچنے کی تدبیر یہ ہوگی۔ ان لوگوں کے سامنے حضرتِ نوحؑ کشتی بنا رہے تھے وہ مذاق اڑا رہے تھے اس چیز کا' یہ تھی ان کی سرکشی یہ تھی ان کی معصیت۔ اگر وہ اپنی جذبات کی تاریکیوں میں نہ ہوتے ضد نہ کرتے

کہ جو کچھ یہ کرے گا ہم نے اس کے خلاف کرنا ہے۔ دیکھ رہے تھے سامنے کہ یہ کچھ کر رہا ہے بتا بھی وہ رہے تھے کہ یہ اس لیے کر رہا ہوں۔ اگر وہ بھی کشتیاں بنا لیتے وہ بھی بچ جاتے۔ یہ جو گناہ ہے جس کی پاداش میں وہ ڈوبے یا ہم ڈوبے اور ڈوبنے والے ڈوبتے ہیں اور وہ نیکی جس سے بچنے والے بچ سکتے ہیں۔ جہاں تک فطرت کے حوادث کا تعلق ہے میں وہاں تک گفتگو کر رہا ہوں۔

گناہ اور نیکی کے الفاظ جرم اور جرم سے بچنے کے لیے تدابیر کا مفہوم پیش کرتے ہیں

وہ یہی ہے کہ جو قوم صحیح تدابیر نہیں کرتی ان پہ تباہی آ جاتی ہے' جوان کے لیے تدبیریں کر لیتی ہے وہ تباہیوں سے بچ جاتی ہے۔ جسے گناہ کہا جاتا ہے گناہ کا لفظ نہ استعمال کیجیے کہ ہمارے ذہنوں میں اس سے خاص قسم کا تصور آتا ہے' نیکی کے متعلق بھی ہمارا تصور محدود ہو گیا ہے۔ کہیے کہ یہ تباہی آتی ہے قوم کے اس ''اجتماعی جرم'' کے بدلے میں کہ اس نے اس سے بچنے کی تدبیریں اختیار نہیں کی تھیں۔ جرائم کہیے عزیزانِ من! گناہ نہ کہیے۔ کہ یہ سارے بچنے والے معتبر ایک طرف ہو کے بیٹھ جاتے ہیں اور ان مرنے والوں کے کان میں آخری وقت میں یہ ڈال دیتے ہیں کہ تم گناہگار تھے تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں یہ کچھ ملا۔ آواز یہ بلند ہونی چاہیے کہ جو ذمہ دار افراد تھے ان کے مجرمانہ تغافل کی بناء پر یہ سب کچھ ہوا' جرائم کی وجہ سے یہ ہوا اور جرائم یہ ہیں۔ غالباً 1955ء میں یہاں عالمگیر سیلاب آئے تھے۔ میں یہاں سے دور تھا اس زمانے میں کراچی میں تھا' اتنا قریب ہو کے نہیں دیکھا تھا۔ 55 کے بعد یہ 18 سال کا عرصہ ہو گیا۔ مجھے پہلے علم نہیں تھا معلوم ہوا ہے کہ اس زمانے میں Flood Control Commission مقرر کیا ہوا تھا اور وہ آج تک مقرر ہے۔ 18 سال کا عرصہ کچھ کم عرصہ نہیں ہوتا۔

سیلاب کے خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے قابلِ عمل تجاویز

یہ اس طرح بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ ہمارے ہاں سیلاب کیوں آتے ہیں اور اکثر آتے رہتے ہیں۔ ان کی شدت میں کمی بیشی ہوتی ہے سیلاب تو اکثر آتے رہتے ہیں۔ دریاؤں کے راستے میں جو بھی ملک ہو گا وہاں امکان ہے اس چیز کا کہ سیلاب آ جائیں۔ ان کے آنے کی وجوہات ہوتی ہیں' طبعی وجوہات (Physical Causes)' انہیں معلوم کیا جائے۔ اس کے بعد ایک Plan بنایا جائے لمبے عرصے تک کے لیے کہ تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا۔ اس بارش پہ قابو اگر ہمارا نہیں ہے جہاں یہ برستی ہے وہ بارش جو تباہیاں لاتی ہے ان تباہیوں کے لیے تو حفظِ ماتقدم کے طور پر تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس پندرہ سال کے عرصے میں اگر ہم پچھلے Flood سے ان طوفانوں سے ایک سبق حاصل کرتے اور اس دوران میں اس کے لیے یہ تدابیر اختیار کی جاتیں تو یہ تباہیاں کبھی نہ آتیں۔ سیلاب آتا تباہیاں نہ آتیں۔ جس نسبت سے ہماری تدبیریں ہوتیں اس نسبت سے تباہیاں کم ہوتیں۔ یہ مجرمانہ تغافل تھا جس کی وجہ سے یہ عالمگیر تباہی ہو گئی ہمارے ہاں۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ الفاظ خاص طور پہ استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں کی مذہبی فکر نے ارضی، سماوی تباہیوں سے بچنے کے طریق کی طرف آنے ہی نہیں دیا

یہ ساری چیزیں ہمارے دورِ ملوکیت کے اندر وضع ہوئیں یہ سازش تھی۔ جب بھی اس قسم کا کوئی ارضی یا سماوی حادثہ پیدا ہوا۔ یہ راجہ اور برہمن کی ملی بھگت' بادشاہ اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ۔ انہوں نے مساجد میں خانقاہوں میں میدانوں میں شروع کر دیا چلانا' قوم کو رعایا کو اس زمانے میں یہ کہنا کہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے یہ ہوتا ہے۔ تاکہ کسی کی توجہ ادھر اٹھنے نہ پائے کہ یہ جو ذمہ دار بیٹھے ہوئے ہیں اوپر یہ ان کے جرائم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تم توبہ کرو تم استغفار کرو تم نفل پڑھو تم خدا کے حضور گڑگڑاؤ۔ لگا دو انہیں اس طرف تاکہ ان میں سے کوئی اٹھ کے اس سے نہ پوچھے جو تخت کے اوپر بیٹھا ہوا ذمہ دار ہے کہ تم نے جو اس خطۂ زمین کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اس کے لیے کیا کیا تم نے' تم مجرم ہو تم ملزم ہو توبہ تمہیں کرنی ہوگی۔ اور توبہ کے معنی یہ ہیں کہ پہلی دفعہ اگر ہوا ہے تو اس کے بعد یہ توبہ کرو کہ دوبارہ نہیں ہوگا دوبارہ اگر ہوگا تو بخشے نہیں جاؤ گے۔

اصل مرض تو مذہبی پیشوائیت کی پھیلائی ہوئی گمراہی اور ابلیسی ملوکیت کی فریب کاریاں ہیں

دیکھتے ہیں عزیزانِ من! ان الفاظ کے معنی اب کیا ہو گئے۔ کہنے کی بات یہ تھی۔ انہوں نے توجہ ہی ادھر نہیں مڑنے دی۔ ہماری ساری تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ جو جن تباہیوں کے ذمہ دار تھے توجہ اس طرف نہیں اٹھنے دی۔ بھوکے مر رہے ہیں صاحب دنیا مر رہی ہے بھوکی' وعظ پر وعظ ہو رہے ہیں کہ کوئی نہیں رزق تو اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ بھوکے مر رہے ہو اُس سے جا کے پوچھو' اِس سے نہ پوچھو جو ذمہ دار بن کے بیٹھا ہوا ہے جس کی بدنظمی کی وجہ سے یہ بھوک اور پیاس آ رہی ہے۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں صاحب' خدا کی طرف سے یہ تازیانۂ عبرت برسائے جا رہے ہیں کوڑے' غضب ہے خدا کا' عذاب ہے اس کا۔ یہ ذمہ دار نہیں ہے جو اقتدار کی کنجیاں ہاتھ میں لیے تخت پر بیٹھا ہے۔ نگاہوں کا رخ اُدھر آنے نہیں دیتے۔ یہ ہوتی ہے ابلیسی ملوکیت' یہ ہوتی ہے اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی سازش کہ اصل Cause اور سبب کی طرف نگاہ نہ اٹھنے دے۔ بھوک ہو افلاس ہو' رزق خدا کے ہاتھ میں ہے ہر مصیبت اس کی طرف سے آتی ہے ہر عذاب اس کی طرف سے آتا ہے اِن کی وجہ سے نہیں آتا۔ وجہ تمہارے گناہ ہوتے ہیں۔ تدبیر: گڑگڑاؤ' روؤ تم توبہ کرو' اِسے جو کچھ کرتا ہے کرنے دو۔ یہ ہے عزیزانِ من! وہ چیز کہ جس سے یوں کہیے کہ ہم تو اتفاق سے بچ گئے یا جوان میں سے اپنی تدبیر سے بچتے ہیں یعنی انہوں نے تدبیریں یہ کی ہوتی ہیں کہ ایسے حوادث آئیں بھی تو ہم بچ جائیں۔

فکرِ قرآنی تو انسانوں کی سوچ میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہے

ایک تو ہم اس تباہی سے بچ جاتے ہیں پھر اپنے ذہن میں غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم گناہگار نہیں ہیں۔ یہ خدا کا عذاب تو گنہگاروں پہ آتا ہے لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے آتا ہے یہ مرنے والے جو ہیں یہ سارے کے سارے یہ گناہگار ہیں فاسق ہیں فاجر

ہیں گناہگار ہیں۔قرآنِ کریم' عزیزانِ من! نگاہوں کا زاویہ بدل دیتا ہے وہ ہر حادثے اور ہر واقعہ کے سبب کی طرف پہلے رخ کو موڑتا ہے۔ یہ پتہ لو کہ یہ کیوں ہوا ہے۔خدا بار بار کہتا ہے کہ ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے' یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتیں ہوتی ہیں۔تو پہلی چیز یہ ذہن کے اندر قرآن راسخ کر دیتا ہے کہ جب بھی کوئی مصیبت آئے تو یہ دیکھو کہ وہ ہاتھ کونسے ہیں جن کی لائی ہوئی یہ مصیبت ہے۔اس فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ یہ ہمارے ہاتھوں کی لائی ہوئی نہیں ہے اُس کی طرف سے یہ کسی طرح آتی ہے۔

ہر ہونے والا واقعہ قوانین خداوندی کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے

اس کی طرف سے آنے کے معنی ہوتے ہیں اس کے قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے۔قوانین کہیے۔قانون اس کا یہ ہے کہ اگر سیلاب کے راستے میں پانی کے راستے میں مکان بناؤ گے اور حفاظتی تدبیر نہ کرو گے تو پانی تمہارے مکان کو بہا کر لے جائے گا۔ یہ خدا کا قانون ہے۔یہ مکان والا اگر اس پانی کی رہگذر میں مکان بناتا ہے حفاظتی تدبیر نہیں کرتا' پانی آتا ہے بہا کے لے جاتا ہے۔تو جب یہ کہا جائے گا کہ خدا کی طرف سے یہ ہوا' کہو کہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی کا یہ نتیجہ ہوا۔اور قانون یہ تھا کہ سیلاب کی رہگذر میں یا تو بستی بساؤ نہیں' بساؤ تو اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کریں کہ پانی کی موجیں آئیں سر ٹکرا کے دوسری طرف چلی جائیں۔انسان کو تو بلا بنایا ہے اس نے' ساری کائنات وہ کہتا ہے کہ تابع تسخیر ہے تمہارے ہاں۔یہ جو چیز تھی کہ کائنات کی قوتوں کو جو قوم مسخر نہیں کرتی وہ خدا کی معصیت کرتی ہے وہ گناہگار ہے۔

قوانینِ فطرت ہوں یا انسانی زندگی انہیں دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا

ہم نے خدا کے ان قوانین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔یہ جو قوانینِ فطرت ہیں ان کے متعلق تو سمجھا یہ ہے کہ یہ کسی اور کے بنائے ہوئے ہیں۔قوانینِ فطرت کا اتباع کرنے والی قومیں ملحد ہیں بے دین ہیں دہریے ہیں یہ ہیں وہ ہیں ایک دم Condemn۔دوسرا حصہ ہے وہ خدا کے قوانین کا جنہیں ہم اپنے ہاں نیکی اور بدی کا معیار قرار دیتے ہیں۔عزیزانِ من! یہ دونوں قوانین خدا کے ہیں ان دونوں قوانین کی صداقت پر ایمان لانا ایمان دار مومن بناتا ہے۔ان دونوں کا اتباع کرنا عملِ صالح ہے۔ان دونوں کی معصیت کرنا خدا کی معصیت ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ ان دونوں کے اندر جب ان کو الگ الگ آپ رکھ دیتے ہیں یہ شرک ہو جاتا ہے۔وہ قومیں کہ جنہیں دہریہ ملحد بے دین کہتے ہیں وہ یہ جو حصہ ہے خدا کے قوانین کا وہ ان کی صداقت پر تو ایمان رکھتے ہیں ان کی معصیت نہیں کرتے ان کی اطاعت تو کرتے ہیں۔لیکن وہ جو دوسرا حصہ ہے خدا کے قوانین کا جس کا تعلق عالمِ انسانیت سے ہے اس کا انکار کرتے ہیں اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔نتیجہ یہ کہ وہ خود تو محفوظ رہ جاتے ہیں ان کے ہاتھوں سے باقی انسانیت محفوظ نہیں رہتی۔اور مومن وہ ہے کہ جو ان دونوں قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے ان کے مطابق اپنا نظام قائم کرتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان قوانینِ فطرت کی

اطاعت سے تدابیر ایسی محکم کر لیتا ہے کہ خود ان سے محفوظ رہتا ہے اور وہ جو اقدارِ سماوی کہلاتی ہیں انسانیت کے متعلق قوانین جنہیں میں نے کہا ہے ان کی اطاعت سے باقی انسانیت بھی ان کے ہاتھوں محفوظ رہتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت المومن یعنی امن دینے والا کی ہے

مومن کہتے ہیں جو امن دینے والا ہو۔ یہ معنی ہی کبھی ہمارے سامنے نہیں آئے۔ وہ جو خدا نے اپنے آپ کو المومن کہا ہے تو اگر مومن کے معنی ایمان لانے والا ہی صرف ہو تو یہ خدا کس چیز پہ ایمان لاتا ہے جو اپنے آپ کو المومن کہا ہے۔ تو المومن اس نے کہا ہے کہ وہ امن دینے والا ہے کائنات کو۔ اسی طرح اس کے بندے جو مومن کہلاتے ہیں وہ ٹھیک ہے کہ اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لانے والے آپ کہہ لیجیے۔ نتیجے کے اعتبار سے خدا کی صفت جو ہے المومن ہونے کی یہ عالمِ انسانیت میں اس صفت کے عملاً ظہور میں لانے کے موجب بنتے ہیں امن کے ذمہ دار ہوتے ہیں علمبردار ہوتے ہیں انسانیت کے امن کے۔ تو انسانیت کو امن تو وہی دے سکیں گے جو خود امن میں ہوں۔ جو خود بھوکی قوم ہو وہ دوسروں کو کیا کھلائے گی۔ جسے پانی جیسی چیز کہ جس پہ مدار ہے زندگی کا وہ ان کی موت کا باعث بن جائے وہ دوسری قوموں کو کیا حیات بخش چیزیں دے گی۔

کائناتی قوتوں کے ماحصل کو اقدارِ سماوی کے تابع صَرف کرنے والے کو قرآن مومن کہتا ہے

یہ ہے چیز عزیزانِ من! جس طرف توجہ کا رخ جانا چاہیے۔ یہ ہیں خدا کے قوانین جن کی معصیت ہم نے کی۔ تو ایک قوم تو وہ ہوگئی کہ جو فطرت کے قوانین کو بھی مسخر کرتی ہے اور انہیں پھر جیسا میں کہا کرتا ہوں اقدارِ سماوی کے تابع ان قوتوں کو صرف کرتی ہے۔ خود بھی امن میں رہتی ہے دنیا کو بھی امن میں رکھتی ہے۔ یہ ہیں جنہیں مؤمنین کی جماعت کہا جاتا ہے جو قرآن تیار کرتا ہے۔

قوموں کی دوسری اور تیسری کیٹگری کی کیفیت اور ان کے کردار کی پسماندگی

ان سے نیچے وہ قومیں ہیں جو فطرت کے قوانین پر ایمان رکھتی ہیں ان کے مطابق اطاعت کرتی ہیں۔ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں دوسرا حصہ چونکہ اس پہ ایمان نہیں ہوتا ان کا' انسانیت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہتی لیکن خود تو کم از کم محفوظ ہوتے ہیں' فطرت کی قوتوں سے خود تو بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک تیسری قوم ہے کہ جو ان دونوں قوانین میں سے کسی پہ بھی ایمان نہیں رکھتی نہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے۔ اور جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی وہ اقدارِ سماوی کے ماتحت ان کا استعمال کیا کرے گی وہ تو مسخر ہی نہیں کرتی۔ جسے کہا جائے گا کہ اپنے خرچ میں اعتدال رکھو' اسے کہا جائے گا نا جس کے پاس کچھ ہو۔ جس کے پاس ہی کچھ نہیں ہے اس کو یہ حکم کیا کہ صاحب اس میں اسراف نہ کرو اپنے خرچے میں' وہ کہے گا میرے پاس تو پیسہ ہی ہے نہیں۔ جو قوم فطرت کی قوتوں کو بھی مسخر نہیں کرتی اقدارِ سماوی کے ساتھ اس کا تعلق ہی کچھ نہیں ہوتا۔ (خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ) یہ ہے وہ مقام عزیزانِ من! جہاں ہم

کھڑے ہوئے ہیں۔ الفاظ باقی رہ گئے ہمارے پاس' وہ بھی اب دھوکا دینے کے کام آتے ہیں ان بیچاروں کو جن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب ہماری قوم کی مجرمانہ تغافل ایک بلا لاتی ہے ایک سیلاب لاتی ہے انہیں کھڑے ہو کے ہم کہتے ہیں کہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے یہ کچھ آیا' ہم بڑے نیکوکار ہیں۔ عزیزانِ من! قوم پوری کی پوری گناہگار ہوتی ہے۔ یہ جرائم قومی کہلاتے ہیں اجتماعی کہلاتے ہیں ملی کہلاتے ہیں۔ اور یہی ہیں جن کی وجہ سے قرآن نے یہ کہا تھا کہ بچو اس فتنے سے کہ جب وہ آیا کرتا ہے تو (خاصة للظلمین) نہیں رہا کرتا پھر' ساری قوم اس کے اندر مبتلا ہوتی ہے۔ یہ کبھی کسی نے کہا تھا کہ سیلاب نہ پرسد کہ درِ خانہ کدہ مست''؟؟؟ اے پچھدا ہیگا کہ جی گھر دا دروازہ تہاڈا کدھر ہے میں کدھروں دی آواں جی ذرا دسنا' اندروں کنڈی تے کھولو' وہ نہیں پوچھتا یہ۔ اور جب وہ نہیں پوچھتا عزیزانِ من! تو وہ سیل بلا آتا ہے تو وہ مندر اور مسجد میں بھی تمیز نہیں کرتا دونوں کو بہا کے الگ چلا جاتا ہے۔ بلکہ اگر مندر کی عمارت زیادہ مستحکم ہے تو وہ بچ جاتی ہے مسجد کے بھی مقابلے میں۔ فطرت کے حوادث کے سامنے یہ چیز کوئی شے نہیں ہے۔ مسجد تو ایک طرف رہا کعبہ بھی جلا وہ بھی سیلاب کی زد میں آیا جب حفاظتی تدابیر نہیں کی گئیں تھیں' ہم کس بلا کی مٹی ہیں۔

قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والوں کا فریضہ تو پوری انسانیت کو تحفظ فراہم کرنا ہے

عزیزانِ من! یہ حوادث فطرت کے کائنات کے جو قوانین ہیں ان کی رو سے آتے ہیں۔ ان کے متعلق علم حاصل کرنا قرآن ماننے والوں کا اولیں فریضہ ہے۔ پھر علم حاصل کرنے کے بعد ان کی روک تھام کا انتظام کرنا حفاظتی تدابیر کرنا اعمالِ صالح کا پہلا حصہ ہے۔ اور پھر اس کے بعد اتنا صاحبِ قوت اور صاحبِ تدابیر ہونا کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی اس قسم کی کوئی مصیبت آئے وہاں جا کے اپنے سینہ سپر ہو کے کھڑے ہو کے ان کو بھی روکنا۔ میں نے کہا ہے نا کہ یہ سیلاب تو نہیں فرق کرتا مسجد اور مندر میں۔ مومن کے متعلق کہا گیا کہ سیلاب ان کو تباہ کرنے میں فرق نہیں کرتا' تم ان کو محفوظ رکھنے میں فرق نہ کرنا۔ یاد نہیں قرآن کی وہ آیت جس میں اس نے کہا ہے سورۃ حج میں کہ اگر ہم اس قسم کی جماعت تیار نہ کریں جسے جماعتِ مؤمنین کہا جاتا ہے نہ یہودیوں کے سومے بچیں نہ عیسائیوں کے گرجے بچیں نہ ہندوؤں کے مندر بچیں نہ تمہاری مسجدیں بچیں۔ یہ ہے وہ قوم۔ پھر قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ پہلے دوسرے مذاہب کے عبادت کدوں کو لیا آخر میں مسلمانوں کی اپنی مسجد کا ذکر کیا۔ اور جو قوم اپنے گھر کو بھی نہیں بچا سکتی وہ دوسروں کی عبادت گاہوں کو کیا بچائے گی۔ پہلی چیز تو عزیزانِ من! یہ ہے ان حوادث کے متعلق یہ تدابیر اختیار کرنا یہ بھی اطاعت ہے قوانینِ خداوندی کی۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ جب یہ حادثہ آ جائے تو پھر اس سے نمٹا کس طرح سے جائے۔ یہاں آتے ہیں وہ دوسرے اقدارِ خداوندی جسے میں نے کہا ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں شدید قحط اور پھر طاعون پھوٹنے کے واقعات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا علاج

ہمارے صدرِ اول کی تاریخ میں بھی یہ حادثہ آیا بلکہ بیک وقت دو سماوی آفات تھیں۔ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں قحط بڑا شدید پڑا طاعون بڑی شدت سے ہوا۔ طاعون کے متعلق تو ساری بات حضرتِ عمرؓ کے ایک فقرے میں سمٹ کے آ گئی۔ وہ فقرہ کہ جس کی مثال میں یونان کے Plato سے لے کے آج تک کے برگسان کے ہاں کہیں نہیں پاتا۔ علیٰ وجہ البصیرت یہ بات دعوے سے کہہ رہا ہوں۔ جب آپ وہاں پہنچے ہیں شام کے قریب وہ طوفان پھوٹا تھا۔ وہاں کہا گیا آپؓ سے کہ آگے نہ جایئے' آپؓ نے بیٹھ کے مشورہ کیا وہ آگے علاقہ آتا ہے جہاں طاعون ہے وہاں جانا چاہیے یا واپس چلے جانا چاہیے۔ فیصلہ آپؓ نے یہ کیا کہ نہیں واپس چلے جانا چاہیے اُس علاقے میں جہاں طاعون نہیں ہے۔ اعتراض کرنے والوں نے اعتراض یہ کیا انہوں نے کہا کہ عمرؓ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے ہو۔ بظاہر وزنی اعتراض نظر آتا ہے۔ سنتے ہیں آپ جواب کیا ملا۔ کہا ابوعبیدہؓ سن لو' میں خدا کی ایک تقدیر سے خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔ زاں کہ تقدیرات حق لا انتہا۔ اس کی ایک تقدیر یہ ہے کہ جہاں یہ وبا پھوٹ رہی ہو وہاں چلے جاؤ گے تو متعدی مرض ہے تمہیں بھی لگ جائے گا۔ اس کا دوسرا قانون یہ ہے کہ جہاں یہ نہیں ہے اگر وہاں رہو گے تو اس سے بچ جاؤ گے۔ کہا یہ دوسرا قانون بھی تو میرا نہیں بنایا ہوا یہ بھی تو اسی خدا ہی کا ہے جس کا وہ قانون ہے کہ اگر جاؤ گے متعدی امراض میں تو اس میں گرفتار ہو جاؤ گے' اس سے صاف علاقے میں نکل جاؤ گے تو بچ جاؤ گے۔ دونوں قوانینِ خداوندی ہیں۔

قوانین خداوندی کو اپنانے کے سلسلہ میں انسان کے اپنے فہم اور تدبر کا عمل دخل

سوال صرف یہ ہے انسان کے تدبر کا کہ وہ یہ دیکھے کہ بیک وقت جب دو ممکنات اس کے سامنے آئیں Two Possibilites ان کے سامنے آئیں ان میں سے کونسی اختیار کرنی چاہیے۔ کہنے لگا اس وقت مومن وہ اختیار کرتا ہے جس میں امن میں رہتا ہے وہ۔ اور جب قحط آیا ہے تو آپ سوچئے عرب جیسا اور یہ وادیٔ غیر ذی زرع مکہ اور مدینہ کا علاقہ جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ لیکن بہرحال مدینہ کیپٹل تھا وہاں Provision رکھی جاتی تھی۔ قحط پڑا ہے تو ارد گرد کی باہر کی ساری آبادیاں صحراؤں کے جتنے لوگ رہنے والے تھے کوئی متبادل صورت ہی اس کے سوا نہیں تھی کہ وہاں سے اُمڈ کے آ جاتے اور مدینے آ جاتے۔ اور وہ جوق در جوق آ گئے۔ ٹھیک ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ فوراً ہی ان کے لیے باہر رہنے کا انتظام کر دیا گیا خیمے لگا دیے گئے ٹھیک ہے آتے جایئے۔

فکرِ قرآنی نے حضرت عمر فاروقؓ کو نظرِ شاہین عطا کر دی تھی

یہاں سے پھر وہ نگاہِ فاروقیؓ سامنے آتی ہے۔ آتے ہی فوراً تو یہ چیز ہوئی کہ یہ جو آئے مدینے سے پکا ہوا کھانا یہاں بھیجا گیا

اُنہوں نے کھایا۔لیکن نگاہِ فاروقؓ نے یہ بھانپ لیا کہ وہاں سے پکا ہوا کھانا جب ان کے پاس آتا ہے تو ان میں احساس ایسا پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے دست نگر ہیں خیرات کا کھانا کھاتے ہیں' امت کے دل میں یہ خیال نہیں پیدا ہونا چاہیے۔کیا کیا؟ سارے مدینے والوں سے یہ کہدیا کہ تمہارے گھر میں سارے شہر میں کوئی چولہا نہیں جلے گا۔سب باہر آؤ ان کے ہاں' ایک دسترخوان ہوگا' جو کچھ اندر ہے سب لے آؤ' ایک جگہ پکے گا ایک جگہ کھائیں گے۔اللہ اکبر۔اور انہی میں عمرؓ خود بیٹھا ہوا تھا۔جو ملتا تھا مساوی سب کھاتے تھے۔

پیٹ کی گڑگڑاہٹ عمر کو دھوکا نہیں دے سکتی

مساواتِ محمدی ﷺ کا نام آجاتا ہے۔محمدی ﷺ تو بہت بلند مساوات ہے مساواتِ عمرؓ ہی کو تو دیکھو وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ بعض چیزوں کے نہ کھانے کی عمر بھر ایک کیفیت ہوتی ہے انسان کی طبیعت پہ ان کا اثر ہوجاتا ہے۔آپ تیل نہیں کھایا کرتے تھے' صحت کے حساب سے صرف' لذت اور عیاشی کا تو سوال ہی نہیں ہے۔اتنی بڑی آبادی کے لیے میسر ہی تیل آرہا تھا ان کے اندر خود بیٹھے ہوئے وہی تیل کھایا کرتے تھے۔ابنِ عمرؓ بیٹا کہہ رہا ہے کہ چہرہ جھلس گیا ہے آپ کی رنگت سیاہ پڑ گئی ہے جھریاں پڑ گئیں' پیٹ میں ہر وقت درد رہنے لگا۔تو کہتے ہیں کہ جب یہ زیادہ گڑگڑاتا تھا درد سے تو آپؓ اسے کہا کرتے تھے کہ تیری گڑگڑاہٹ سے میں دھوکے میں نہیں آسکتا کہ باقی امت تو تیل کھائے اور تیری وجہ سے عمرؓ بھی کھانے لگ جائے' عمرؓ فریب میں نہیں آسکتا' اپنے پیٹ کے فریب میں بھی نہیں آسکتا۔

حضرت عمرؓ فاروق کو اپنے دورِ خلافت کی ذمہ داریوں کے احساس کی ایک اور جھلک

آپ کی دن بھر کیفیت یہ تھی کہ ان کیمپوں کے اندر پھر رہے تھے ایک ایک کی ضرورت کے مطابق وہاں پہنچاتے تھے۔ایک وہ علاقہ تھا جہاں کے معذور' بچے وغیرہ آنہیں سکتے تھے وہاں کی ذمہ داری خود آپؓ لے لی تھی آپ نے فرمایا کہ ان کی نگرانی میں کرونگا۔ دن بھر یہ ہوتا تھا اور جسے رات بھر اب ہم کہتے ہیں دعاؤں میں گذارتے تھے رات بھر پلاننگ اسکے لیے ہوتی تھی مجلسِ مشاورت بیٹھتی تھی۔رات سوتے نہیں تھے دن یہ کچھ کرتے تھے۔تو یہ چیز ہمارے ہاں تاریخ میں ہے ساتھیوں کی یہ بات کہ ہمیں فکر تھی کہ اگر یہ قحط کچھ عرصہ اور رہا تو قحط سے یہ قحط زدگان تو بچ جائیں گے عمرؓ زندہ نہیں بچے گا۔عزیزانِ من! حادثہ آتا ہے اُسے نپٹایا اس طرح سے جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس قحط میں ایک فرد بھی ہلاک نہیں ہوا تھا۔جو ملتا تھا اسے یوں برابر بانٹا جاتا تھا۔اسی قحط ہی کا واقعہ ہے نا کہ ایک دن اپنے پوتے کو دیکھا کہ وہ کوئی فروٹ پھل کی قسم کی چیز کھا رہا تھا۔ایک دم بیٹے کو بلایا کہ یہ کیا ہے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور عمرؓ کا پوتا فروٹ کھا رہا ہے۔اُنہوںؓ نے کہا سرکار عمرؓ کا پوتا بھی وہی کچھ کھاتا ہے جو دوسروں کو ملتا ہے' صبح ناشتے میں جو کھجوروں کی

گٹھلیاں بچوں کو ملیں کسی کاشتکار کا بچہ کوئی تھا اس کے پاس ککڑی تھی عمرؓ کے پوتے نے اپنے حصے کی کھجوروں کے ستو اس کو دیدیے اور اس نے وہ ککڑی اس نے اس کو دیدی یہ وہ ککڑی کھا رہا تھا فروٹ نہیں کھا رہا تھا۔ حادثہ آتا ہے تو پھر نپٹا یوں جاتا ہے۔

مرا مرنا خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے

یہ حادثہ درحقیقت ان کا حادثہ نہیں ہوتا جن کے اوپر براہِ راست بلا گرتی ہے یہ حادثہ ان کے لیے ہوتا ہے جو ابھی محفوظ ہوتے ہیں۔ وہ جو میں نے ایک دن بے ساختہ اس مرحوم دوست کا مصرع سنایا تھا آج بار بار یاد آتا ہے کہ میرا مرنا خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے۔ پتہ نہیں کس عالم میں یہ کہہ گیا تھا۔ یہ جو مرنے والے ہوتے ہیں حوادث میں عزیزانِ من! ان کا مرنا ہم جینے والوں کے خلوص کی آزمائش ہوتا ہے۔ گناہگار وہ نہیں تھے جو اس سیلاب کے اندر مر گئے۔ پہلے گناہگار وہ تھے کہ جنہوں نے حفاظتی تدبیریں ان کے لیے نہ کیں اور اس کے بعد گناہگار ہم ہیں جو حادثے کے شکار ہوئے اور ان کے لیے کچھ نہیں کر رہے یا جتنا کرنا چاہیے وہ نہیں کر رہے۔ یہاں اگر عمرؓ کے پوتے میں اور بدو کے لڑکے میں تمیز ہو جائے گی یہ ہوگا وہ گناہ جو بخشا نہیں جائے گا جسے کوئی توبہ بخش نہیں سکے گی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے بڑا جرم انسان کی ہلاکت ہے

عزیزانِ من! انسانوں کے گناہ تو انسان بخشا کرتے ہیں۔ خدا نہیں بخشا کرتا۔ اور انسانوں کے گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ قرآن نے یہ گنایا ہے کہ یاد رکھو جس شخص کے ہاتھوں کوئی ایک متنفس بھی ضائع ہو گیا ناحق' جرم کے اعتبار سے سمجھ لو کہ اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ ایک فرد بھی عزیزانِ من! جو بچ سکتا ہے ہمارے کچھ کرنے سے' اگر وہ ہلاک ہو گیا ہے ہمارے اس نہ کرنے سے' خدا کی میزان میں یہ جرم ہے کہ ہم نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔ سوچ سکتے ہیں اس کی سزا کیا ہوگی۔ یہ ہے وہ غضب جسے ہم کہتے ہیں خدا کا آیا کرتا ہے یہ ہیں وہ جرائم جن کی وجہ سے یہ سزائیں ملتی ہیں۔ نگاہ کا رخ اس طرف رکھو عزیزانِ من! پھر بات بھی سمجھ میں آ جائے گی اور پھر آئندہ کے لیے ہم ان تباہیوں سے بھی بچ جائیں گے۔ ورنہ اگر ہم یہی پکارتے رہے کہ یہ مرنے والے اپنے گناہوں کی پاداش میں مر گئے' جینے والے ہم اس لیے جیئے کہ ہم بڑے مقربین بارگاہِ الٰہی تھے۔ آئندہ ہم اسی طرح ان کی زد میں آ جائیں گے۔ سوال اس وقت یہ ہے کہ آج ہم بچنے والوں کے خلوص کی جو آزمائش ہو رہی ہے اس میں ہم کس حد تک پورے اتر رہے ہیں۔ ہمارے مجرمانہ تغافل کی وجہ سے جو بیچارے مر گئے ہیں جو تباہ ہو گئے ہیں ٹھیک ہے ان کی اس تباہی کی سزا بھی ہمیں ملے گی۔ قومی حیثیت سے ساری قوم کو میں کہتا ہوں اس میں ہم شامل ہیں۔ لیکن جو بچ گئے ہیں ان کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے اگر ہم کہ جو اس سیلاب سے اس تباہی سے بچ گئے ہیں اگر ہم سے کوتاہی ہوگی تو یہ اگلا جرم ہوگا جس جرم کی سزا ہمیں الگ ملے گی۔ حفاظتی تدابیر کی طرف سے تغافل برتنے میں پوری قوم کی قوم کو وہ سزا اور ان کے لیے جو کچھ کر سکنا ہے اسے نہ کر سکنے کی ہمیں سزا جو ہم زندہ ہیں۔ اور

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ فطرت کی تعزیریں ہیں نا جو ہم پہ آ رہی ہیں۔

سیلاب سے بچنے والوں کی آسودہ حالی اور سیلاب میں تباہ ہونے والوں کی الم انگیز داستان

آج ہم میں سے ایک ایک کو یہ سوچنا چاہیے کہ میں جو اطمینان سے محفوظ اپنے گھر میں بال بچوں میں بیٹھا ہوا اسی طرح سے وقت کے اوپر کھا رہا ہوں پی رہا ہوں۔ اس لیے کہ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے اس پانی نے اپنا رخ ادھر موڑ لیا تھا' میری اور کوئی کاریگری نہیں تھی۔ وہ جو اس سے بچنے کے لیے درختوں کی شاخوں پر لٹکے رہے تباہ ہونے والے گھروں کی چھتوں کے اوپر بیٹھے رہے ان گذر گاہوں کے اندر کسی نہ کسی طرح سے بچ گئے۔ وہ جو اس وقت سانس لے رہے ہیں اس دھوپ کے اندر سڑی ہوئی دھوپ کے اندر بغیر کسی قسم کے سایے کے' سڑکوں پر' ریلوں کی پٹڑیوں پر' ٹیلوں پر۔ اور جب بارش ہوتی ہے تو اس کے بعد بارش سے بچنے کا کوئی سامان نہیں' پیچھے جانے کا کوئی سامان نہیں کہ جو کچھ پیچھے تھا وہ تو سارا ختم ہو گیا۔ آگے کوئی جگہ نہیں ہے کہ ابھی کوئی بستی بسی نہیں کہ جہاں جا کے وہ بس جائیں۔ وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ کس جرم کی پاداش میں؟ کہ ہم نے ان کی حفاظت کا قبل از وقت انتظام نہیں کیا تھا۔ آج ہم بچے ہوئے ہیں تو اپنی کسی کاریگری کی وجہ سے نہیں بچے ہوئے ہیں۔ غنیمت سمجھنا چاہیے عزیزانِ من! کہ ہم کسی طرح سے اس سے بچ گئے ہیں۔ کم از کم اس بچنے کا صدقہ ہی اتنا دو کہ ایک فرد ایک کو تو بچا لے کسی طرح سے۔ اس سیلاب کی تباہی میں اتنے نہیں تباہ ہوئے جو اس کے بعد ان بچنے والوں میں تباہ ہونگے بھوک سے پیاس سے موسم کی شدت سے بیماریوں سے دوائیاں نہ ملنے سے کھانے کے لیے نہ ملنے سے کسی شیلٹر کے نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور پھر انسانوں کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ سے۔ افوہ۔

سیلاب نے ان کی جان لی اور ان کی غیرت اور عزتِ نفس کو لوگوں نے پامال کیا

پانی کے ہاتھوں لٹنے کا تو اتنا صدمہ نہیں ہوتا عزیزانِ من! جتنا صدمہ اس میں ہوتا ہے کہ ایک دوست شاہدرہ کی بستی سے جان بچا کے اپنے بچوں کو ننھے بچوں کو لے کے یہاں چلا آیا۔ غریب آدمی تھا' پانی تھما تو اس نے کہا کہ میں جا کے دیکھو کہ اس میں سے کوئی دو چار برتن لے آؤں کہ جس میں کم از کم گلاس ہی ایک مل جائے کہ میں بچوں کو پانی پلا سکوں۔ جب وہ گیا ہے تو پانی اتر چکا تھا اور گھر میں سے سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اور یہ قوم جو ہے یہ بچ جائے گی خدا کے عذاب سے جسے آپ کہتے ہیں۔ غریب کے گھر میں تھا کیا' ایک گلاس موجود نہیں تھا کہ جس میں لا کے اپنے بچے کو پانی پلا سکے۔ اور یہ جو بچے ہوئے اول تو خیال ہی نہیں آ رہا تھا خیال آتا ہے تو ان کو جا کے ایسے دیتے ہیں جیسے کسی بھکاری کو گداگر کو خیرات کا ٹکڑا دیتے ہیں۔

تباہ حال گھرانوں کی نوجوان بچیوں کی داستان

عزیزانِ من! خدا کے لیے ان کی جان تو اس عذاب نے لی تھی ان کی غیرت کو تو تم نہ خریدو۔ آج تک اس واقعہ کو نہیں بھول سکتا 1965ء کی جنگ میں جو یہاں سے ہمارے ہاں جنگ کی وجہ سے در بدر ہوئے تھے کچھ لوگ وہ یہاں آ کر ادھر بس گئے ہوئے تھے۔ ان گاؤں کے لوگ شہر میں آ گئے تھے۔ ان کی لڑکیاں جوان لڑکیاں تھی ان میں سے ایسی بھی تھیں جن کی شادی کے دن بھی جسے کہتے ہیں مقرر ہوئی ہوئی تھیں تاریخیں۔ یہاں کے رہنے والوں میں سے کچھ گھرانوں نے یہ کیا تھا کچھ انتظام کیا کہ یہاں اچھا ہے ان کے ہاں کے وہ خاوند یا ان کے سسرال کے لوگ بھی آ گئے ہوئے تھے یہ بھی تھے کہ ان کا نکاح پڑھا دیا جائے بچیوں کی عصمت محفوظ رہ جائے گی۔ یہاں کے رہنے والے ان گھرانے والوں کو اللہ ان کو خوش رکھے اُنہوں نے انتظام اس طرح سے کیا کہ بچیوں کو اس طرح سے وداع کیا جائے کہ جیسے گھروں سے ماں باپ وداع کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے معیار تو وہ نہیں تھا نہ ہوسکتا تھا لیکن ان کو خالی ہاتھوں نہیں جانے دیا تھا۔ ایک سہاگن ایک دلہن کی طرح جیسے وداع کرتے ہیں اتنا کچھ تو کم از کم اسے دیدیا تھا۔ میرے حصے میں اتنی سعادت تھی علاوہ اور چیزوں کے بہرحال جو میں کر رہا تھا کہ ایک نکاح پڑھانے کی چیز تھی وہ بھی میرے ہاں ہوتی تھی۔ ایک بچی کا نکاح پڑھایا اور اسے دینے کے لیے جہیز کی کچھ چیزیں جو تھیں وہ رکھی گئیں۔ بچیاں میرے لیے میری بیٹیاں تھیں مجھے بھی بابا جی اپنا کہتی تھیں۔ ایک بچی نے گھونگھٹ میں سے روتے ہوئے مجھے کہا کہ بابا جی مجھے یہ چیزیں نہ دیجیے۔ میں حیران تھا کہ اس بچی نے یہ کیوں کہا۔ کہا یہاں تک ٹھیک ہے جو آپ نے کیا۔ گاؤں کے لوگ وہاں تھے میں نے ان سے پوچھا کہ اس بچی کی خاص بات کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کی بیٹی ہے باپ بھی وہاں شہید ہوگیا بھائی بھی رہ گئے ماں وغیرہ ہیں۔ نمبردار کی بیٹی ہے اس کی شادی انہی دنوں میں ہونے والی تھی نمبردار نے سات گاؤں کے لوگوں کو دعوت دی ہوئی تھی اور اس کے لیے بھینسیں اور گھوڑیاں اور گائے۔ ہمارے ہاں یہ کچھ بھی دیتے ہیں بیٹی کو یہ بھی دے رہا تھا۔ اور پھر ایک نیکی کے بدلے میں گاؤں کی ایک یتیم لڑکی تھی وہ اس کی بھی شادی کر رہا تھا اس کے لیے بھی اس نے کچھ جہیز بنایا ہوا تھا۔ ٹھیک ہے بیٹی کے پیمانے کا تو نہیں ہوتا تھوڑا ہوتا ہے۔ وہ جہیز اس یتیم بچی کے دینے کے لیے تھا۔ یہ بچی جس کو ہم وداع کر رہے تھے اس کی نگاہ جب ان چیزوں کے اوپر پڑی تو اس نے محسوس کیا کہ یہ اس قسم کی اور ویسے ہی انداز کی خیرات کی چیزیں ہیں جس طرح میرا باپ میری شادی میں ایک یتیم لڑکی کو دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اس احساس کو برداشت نہیں کرسکی اس نے کہا کہ بابا جی مجھے یہ چیزیں نہ دیجیے خدا کے لیے مجھ پہ رحم کیجیے۔ انسانی غیرت اور حمیت تو یہ چیز ہوتی ہے عزیزانِ من! اسے نہ خریدیے اس کا سودا نہ کیجیے۔ دینا ہے کسی نے تو اس طرح سے دو۔

؎ یوں بھیک دے کہ دستِ عطا کو خبر نہ ہو

خیرات کی طرح سے نہ دو۔ عزیزانِ من! ہمارے بھائی بند ہمارے ہی جیسے ہیں۔ ہم سب ایک مشترکہ مصیبت کے اندر گرفتار ہیں' ہمارے پاس کچھ بچ گیا ہے ان کے پاس کچھ نہیں بچا۔ دو بھائیوں میں بانٹ کے کھانے والی جو کیفیت ہے اس انداز سے کچھ کرو۔ یہ کرو تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس دنیا میں بھی آپ کو امن مل جائے گا اور اگر ایمان ہے تو اس کے بعد کی زندگی میں بھی اللہ آپ کی حفاظت کرے گا۔

ملکی اور قومی سطح پر کرنے کا کام: ذمے داروں سے پوچھنے والی بات

یہ ہے عزیزانِ من! آج کرنے کا کام اس قوم کے لیے۔ اور اس کے بعد قوم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت نگاہ رکھے اور پوچھتی رہے کہ ذمہ دار ارباب نے کیا کیا کہ آئندہ کے لیے ایسی تباہی اس ملک پہ نہ آئے۔ بجائے اس کے کہ کچھ لوگ اقتدار پر آ جائیں جو باقی رہ جائیں ان کی کوشش یہ ہو کہ کسی طرح سے اقتدار ان سے چھن کے ہمارے پاس آ جائے۔ مسئلہ ہی سارا یہ رہ جائے۔ بجائے اس کے کہ اس کے اندر یہ سارے کے سارے ذمہ دار ارباب قوم کے ابنائے قوم جنہیں کہتے ہیں وہ اس کے اندر سارے کے سارے آ جائیں۔ اس کی بجائے ان سے ہر وقت پوچھئے کم از کم اس سیلاب کے بعد یہ ایک سوال تو پوچھتے رہیے۔ جو بھی تمہارے پاس آئے مخالف میں آئے موافق میں آئے پوچھئے یہ کہ آپ نے کیا تدابیر اختیار کیں کہ آئندہ کے لیے قوم اس ہلاکت کا شکار نہ ہو۔ یہ پوچھئے عزیزانِ من! ہر لیڈر بننے والے سے پوچھئے' ہر نعرہ لگانے والے سے پوچھئے' ہر جلوس نکالنے والے سے پوچھئے اور ہر ووٹ مانگنے والے سے پوچھئے کہ آپ نے اس قوم کی حفاظت کے لیے کیا تدابیر اختیار کی ہیں۔ اور اس معیار کے مطابق یہ جائزہ لیجیے کہ یہ اس قابل ہے کہ اس کی کوئی بات مانی جائے۔ اگر عزیزانِ من! عوام کی بات آج کچھ معنی رکھتی ہے کہ جسے ہر وقت کہا جاتا ہے۔ عوام کی بات کے معنی یہ ہونگے کہ اب یہ جینے والے عوام یہ پوچھیں اور ان میں سے ہر ایک سے پوچھیں کہ اس دفعہ ہم تو بچ گئے ہیں۔ آپ نے کیا انتظام کیا ہے کہ آئندہ کے لیے یہ ہلاکت ہمارے سر پہ مسلط نہ ہو جائے۔

خدا تعالیٰ کے نزدیک وعدے کی اہمیت اور قدر و منزلت

یہ صرف کسی کے وعدے پہ نہ رہیے۔ وعدہ تو اس انداز کا ہونا چاہیے میں نے پہلے بھی ایک درس میں یہ چیز کہی تھی۔ وعدہ کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم نے کئی مقامات کے اوپر خدا کا وعدہ بھی یہ کہا ہے ہم نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے ہم نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس نے ایک جگہ کہا ہے کہ ہم تو بڑے؟؟ القول واقعہ ہوئے ہیں بات کے سچے (لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ) کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ اس کی تاکید کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ ہمارا وعدہ بھی وہ ہے کہ اگر تم کسی وقت دیکھو نہیں پورا ہوا تو ہم سے بھی پوچھ سکتے ہو کہ کیوں پورا نہیں ہوا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ (ان وعد ربك كان مسئولًا)۔ وعدہ تو وہ چیز ہے عزیزانِ من! یہ سارے

وعدے ہیں نا جو ایسے وقتوں میں کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فریضہ ہو جاتا ہے وعدہ کرنے والا کہ وہ بتائے کہ میں یوں پورا کر رہا ہوں۔ اور فریضہ ہو جاتا ہے اس کا کہ جس کے ساتھ وعدہ کیا جائے کہ وہ اس کے بعد پوچھے کہ یہ وعدہ جو کیا تھا وہ پورا کیوں نہیں ہوا کیوں وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ اور اس چیز کو سب سے پہلا بنیادی جرم قرار دو۔ یہ ہے عزیزانِ من! بچنے کی بات۔ اس معلمِ صادق ﷺ نے جو قوم کو تعلیم دی تھی وہ تو ایک قدم آگے لے گیا تھا قوم کو۔

حضرت عمر فاروق ؓ کا طرزِ عمل اور اندازِ خلافت حکومتِ الٰہیہ کا ترجمان تھا

شام کے صحرا میں حضرتِ عمرؓ اپنے معمول کے مطابق بذاتِ خود جا کر ایک ایک کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔ اپنے اخبارات پر ہی بھروسہ نہیں کیا کرتے تھے خود جا کر معلوم کیا کرتے تھے کہ حال کیا ہے۔ ایک بوسیدہ سے خیمے میں گئے وہاں ایک بڑھیا تنہا بیٹھی تھی۔ اس سے پوچھا (آپ کی زبان میں کہونگا) کہ مائی کیا حال ہے تمہارا۔ اس نے کہا کہ تمہیں میں حال کیا بتاؤں جس کو حال پوچھنا چاہیے جب اسے ہی اس کی پرواہ نہیں ہے تو میں کسی دوسرے کو حال بتانے کو تیار نہیں ہوں۔ کہا کہ مائی وہ کون ہے کہ جس کے ذمہ تمہارا حال پوچھنا تھا۔ کہا کہ وہ جو زمامِ خلافت اپنے ہاتھ میں کے بیٹھ گیا ہے وہ جس نے پہلے اپنے خطبے میں یہ اعلان کیا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پہ عائد ہوگی۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ میری مصیبت کا پوچھتا۔ میں سمجھتا ہوں اتنے سے ہی کچھ کم اوس نہیں پڑی ہوگی کہ آپؓ نے اگلی بات بھی کہدی کہ مائی تم نے اپنی مصیبت کا حال اس تک پہنچایا تھا؟ اور آگے جواب عمرؓ کی زبانی سنیے جو ساری عمر دہراتے رہے اس جواب کو اور روتے رہے۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے اس بڑھیا نے بتایا کہ یہ خلافت کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے' اُس نے کہا کہ یہ اس تک حال پہنچانا میرا فریضہ نہیں تھا یہ اس کا فریضہ تھا کہ وہ ایک ایک فرد کے متعلق باخبر رہتا۔ اور آگے کہا کہ اس نے کہا تھا کہ جو خدائے خبیر کے نام پر ہم سے اطاعت لیتا ہے اسے اتنا خبیر ہونا چاہیے کہ ہر فرد کی خبر اس کے پاس موجود ہو۔ کہتا ہوں کیا تعلیم حضور ﷺ دے گئے تھے اس قوم کو' کیا قرآن سمجھا گئے تھے اس قوم کو۔ یہ لفظ تو ہمارے ہاں متواتر چلا آیا خدا کے نام پر حکومتِ الٰہیہ جسے ہم کہتے ہیں خدا کے نام پر حکومت قائم کرنا۔ پوچھو اس بڑھیا سے کہ وہ کیا بات سمجھی تھی۔ خدا کے نام پر حکومت قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں انسانوں کے متعلق وہ ذمہ داریاں ان کے ہاتھوں سے پوری ہونگی۔ وہ خبیر ہے وہ خدا' ان کی ذمہ داری ہے کہ یہ خبیر ہوں ساری مملکت کے لیے۔ ساری عمر روتے رہے حضرتِ عمرؓ اس کے بعد' کہا خلافت کی ذمہ داری اس بڑھیا نے مجھے سمجھائی تھی کہ یہ ہونا چاہیے۔ اور یہ جو بات میں نے کہدی ہے کہ خدا نے جو ذمہ داریاں لے رکھی ہیں وہ ان کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہیں' ان کی ذمہ داریاں وہ ہو جاتی ہیں۔ یہ چیزیں بھی کوئی ہمارا بعد کا تراشیدہ فلسفہ نہیں۔

مملکتِ اسلامیہ کی ذمہ داریوں کا تعین اور انہیں پورا کرنے کا طریق

عزیزانِ من! یہ بھی تو قرآن ہی سے حاصل کردہ بصیرت اور علم ہے اسے بھی تو عمرؓ نے ہی سمجھایا تھا۔ یہ چیز کہ خدا براہِ راست ذمہ داریاں پوری نہیں کیا کرتا۔ وہ تو دیگر آیات کے علاوہ سورۃ یٰسٓ کی تو وہ آیت سامنے لائیے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ بھوکوں کی روٹی کا کچھ انتظام کرو تو یہ کہتے ہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ رزق کی ذمہ داری تو خدا نے لے رکھی ہے اگر اسے یہ مقصود ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں روٹی کیوں نہ دیتا۔ تم کیا کہتے ہو اس کی ذمہ داری کو ہم پورا کریں۔ کہا یہ آگے سے جواب دیتے ہیں۔ کہا کس قدر گمراہی میں مبتلا ہیں کہ انہیں پتہ نہیں ہے کہ خدا براہِ راست کسی کے منہ میں آ کے لقمہ نہیں ڈالا کرتا۔ وہ ذمہ داری ان کے ہاتھوں ہی پوری ہوا کرتی ہے جو خدا کے نام پر خدا کی اطاعت لیتے ہیں لوگوں سے۔ یہ چیز تھی۔ اور وہ بات جو میں ابھی کہہ رہا تھا کہ یہ بات بھی عمرؓ نے ہی ہمیں سمجھائی۔ پہلی بات تو میں نے تقدیر کے معاملے میں کہی تھی میں نے عرض کیا تھا کہ میں اس کی مثل ایک فقرہ نہیں جانتا۔ یہ جو دوسری چیز ہے اس نے تو یقین مانئے عمر بھر کے لیے مجھے ایک عجیب وجد کی کیفیت میں رکھا ہوا ہے۔ جب پہلی دفعہ یہ سامنے آئی تھی میں عرض نہیں کر سکتا کہ کتنے دنوں تک مجھ پہ ایک محویت کا عالم رہا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اس سے پیشتر کہ خدا نے یہ چیز کہی ہوئی ہے کہ (اجیبوا دعوۃ الداعی اذا دعنی) ہر پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ اعتراض دل میں سے یہ اٹھتا تھا کہ روز پکارتے ہیں وہ تو پکار کا جواب نہیں ملتا۔ مصیبت زدہ مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں بھوکے بھوکے رہتے ہیں۔ یہ کہاں سے جواب ملتا ہے یہ۔ حضرتِ عمرؓ نے سمجھا دیا۔ اور یہ تو میں کبھی تفصیل میں عرض کرونگا اسلام کا صحیح نظام تو میں نے سمجھا ہی حضرتِ عمرؓ سے ہے۔ سیرتِ انسانیہ کی معراجِ کبریٰ نبی اکرم ﷺ سے سمجھی۔ حوادث کے زمانے میں دین کو مستحکم کس طرح سے رکھا جا سکتا ہے صدیقِ اکبرؓ سے سمجھا۔ اور استحکام کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد یہ نظامِ خداوندی کیسے عملاً متشکل کیا جاتا ہے سیرتِ فاروقؓ سے سیکھا میں نے۔ سنیے کہ وہ اس مشکل ترین آیت کو سمجھاتے کس طرح سے ہیں۔

خدا سے دعا ہم کب کرتے ہیں؟ جب کوئی ہماری ضرورت رکی ہوئی ہوتی ہے جب کوئی مصیبت آتی ہے جس کا حل نہیں ملتا۔ جب یہ ضرورتیں پوری ہوتی رہیں مشکلات کے حل آتے چلے جائیں ضرورت نہیں پڑتی ہے پھر۔ سنیے ان کا فقرہ۔ کہا کہ خدا نے مجھے یہ ذمہ داری خلافت کی اس لیے سونپی ہے۔

حضرت عمرؓ فاروق کا فرمان کہ جب تم خدا سے دعا کرتے ہو تو یہ میری خدا سے شکایت ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! یاد رکھیے گا یہ الفاظ۔ اس لیے سونپی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں راستے میں روک لوں۔ اگر تمہاری کوئی دعا خدا تک پہنچ گئی تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ میری شکایت ہوگئی کہ جو ذمہ داری اس نے پوری کرنی تھی اس نے نہیں کی

اس لیے ہمیں تمہارے ہاں آنا پڑا۔ کہا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ ذمہ داری اس لیے دی گئی ہے۔ چار لفظ ہیں عزیزانِ من! سوچئے کیا کچھ کہہ گئے ہیں یہؓ۔ یہ اس لیے دی گئی ہے کہ میں تمہاری کسی دعا کو خدا تک نہ پہنچنے دوں وہاں تک پہنچی تو میری شکایت ہو جائے گی۔

مملکت پاکستان کے آئین کو عملی شکل دیئے بغیر یہ مملکت اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی

یہاں بات عزیزانِ من! کسی آئین میں لکھ دینے سے نہیں ہے کہ کائنات کا اقتدارِ اعلیٰ خدا کا ہے ریاست کا مذہب اسلام ہوگا خدا کی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ سب کچھ کریں گے۔ ٹھیک ہے آئینی طور پر اس کا اعلان ضروری ہے۔ لیکن اس اعلان کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد خبیر ایسا ہونا پڑے گا جیسا اس بڑھیا نے شام کے دشت میں عمرؓ سے کہا تھا۔ اور اس کے بعد ذمہ دار ایسا ہونا چاہیے تھا کہ جو اس ذمہ داری کے احساس کرنے والے نے یہ کہا تھا کہ مجھے یہ ذمہ داری اس لیے سونپی گئی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں۔ تمہاری اگر کوئی ضرورت رکی رہے تو پلا پکڑ لو میرا' راستے میں کھڑے ہو جاؤ گریبان پہ ہاتھ ڈال دو گلا دبا دو کہ عمرؓ یہ کیوں نہیں ہوا۔ وہ جو عمرؓ اعلان کرتا ہے کہ دجلہ کے کنارے' مدینے میں بیٹھا ہوا دجلہ کے کنارے' اس دور میں' مملکت کا آخری سرا تھا کوئی انسان بھی نہیں کہ انسان مر جائے' کتا بھی اگر بھوک سے مر گیا۔ اس لیے کہ قرآن نے جہاں یہ کہا ہے کہ خدا کے ذمہ رزق ہے وہاں صرف انسان نہیں کہا (وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا) کوئی متنفس کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پہ نہ ہو۔ اور یہ ذمہ داری پلٹ کے آ جاتی ہے ان کے اوپر جو خدا کے نام پر یہاں مملکت قائم کرتے ہیں۔ اس لیے آپ نے انسان نہیں کہا تھا کتا بھی کہا تھا۔ اور پھر یہ ذمہ داری کی یہ صورت نہیں ہے بھوک سے نہ مر جائے۔ ٹھیک ہے بھوک اور بھوک مٹانے کا فرق ہوتا ہے۔ ہم اگر اپنی میز پہ بیٹھے ہوئے چار چار دس دس؟؟ چیزیں کہتے ہیں ان میں کھانا کھائیں یہ بھی تو بھوک مٹانا ہے۔ اور وہاں جو بیٹھے ہوئے ہیں ان کے لیے اگر ہم اوپر سے تھیلی میں چنے اور اچار لٹکا دیں یہ بھی بھوک سے بچانے کی صورت ہے۔ اس ذمہ دار کی یہی شکل ہوگی بھوک سے بچانے کی؟ ان کی شکل کچھ اور ہوگی۔

حضرت عمرؓ فاروق کے دورِ خلافت کی نوعیت

شکل وہ ہوگی کہ جب وہ شام کا قاصد حضرتِ عمرؓ کے ہاں آ کے بیٹھا ہے تو اسی وقت کھانے کا وقت آ گیا۔ وہاں یہ کسی قسم کا حجاب اور تکلف تو ہوتا نہیں تھا کہ اگر باہر سے کوئی آ کے بیٹھ کے باتیں کر رہا ہے کھانے کا وقت ہو رہا ہے تو ہم نہ اٹھ کے جاتے ہیں نہ وہاں کھانا منگاتے ہیں۔ وہاں آ گیا اور وہیں وہ کھانا آ گیا۔ وہ کھانا اس نے دیکھا جو کی روٹی تھی تھوڑا سا زیتون کا تیل تھا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنینؓ آپ جو کی روٹی کھا رہے ہیں اب تو مملکت میں اتنا ہوتا ہے کہ آپ گیہوں کی روٹی کھا لیں۔ آپؓ نے کہا کہ مجھے اس وقت یہ تو یقین ہے کہ مملکت میں ہر فرد کو جو کی روٹی مل رہی ہے' کیا تم مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ ہر فرد کو مملکت میں گیہوں کی روٹی بھی مل رہی

ہے۔اس نے کہا کہ نہیں یہ تو میں یقین نہیں دلا سکتا۔تو کہا کہ پھر مملکت کے امیر المؤمنین پر گیہوں کی روٹی اس وقت جائز ہو سکتی ہے جب مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی ملے۔اسے وہ آخری شخص ہونا چاہیے کہ جو گیہوں کی روٹی کھائے جب تک پہلے باقیوں کو نہ مل جائے۔جو کی مل رہی ہے اس کا مجھے اطمینان ہے میں نے کر لیا اطمینان۔یہ کہ گیہوں کی مل رہی ہے اس کا ابھی انتظام و اطمینان مجھے نہیں ہوا۔تم نے یہ کہا ہے کہ وہاں کھا رہے ہو تم لوگ' ٹھیک ہے بڑی خوشی کی بات ہے وہاں کھا رہے ہو۔میں تو اس دن کھا سکونگا کہ جب مجھے یقین ہو جائے کہ ملت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔مساواتِ محمد یہ ﷺ کہا گیا ہے۔

مقامِ آدم اور حوادثِ ارضی وسماوی پر کنٹرول: چین کے دریائے زرد کے متعلق ماؤزے تن کا بیان

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ حوادثِ ارضی وسماوی آتے رہتے ہیں جب تک آدم اس مقام پہ ابھی نہیں پہنچتا اسے تو کہا تھا نا کہ اسمآء کلھا بتا دیے گئے تھے کہ کائنات کے ہر قانون کا علم جب تک ابھی یہ حاصل نہیں کرتا بہت سے گوشے ابھی ایسے ہونگے فطرت کی قوتوں کے جو ہنوز اس کی پہنچ سے باہر ہوں۔کوئی بات نہیں۔علم بڑھتا جائے گا ان میں سے ایک ایک فرشتہ اس کو سجدہ کرتا چلا جائے گا آدم کو۔لیکن جب تک یہ پورا علم حاصل نہیں ہوتا یا جس نسبت سے کسی قوم کو یہ علم حاصل ہوتا ہے یہ ارضی اور سماوی آفات وحوادث تو آتی رہیں گی۔سوال آگے یہ ہوگا پھر کہ ان حوادث سے ہم نپٹتے کس طرح سے ہیں کہ یہ کوئی تباہی برپا نہ کریں۔اور یہ ہے قرآنِ کریم کی تعلیم عزیزانِ من! جو اس نے ہمیں دی۔پہلی چیز یہ دی کہ یاد رکھو کائنات کی ہر وقت تابع تسخیر ہم نے تمہارے کر دی ہے۔مطمع نگاہ تو یہ ہے کہ اس طرح سے ان کو کنٹرول کو اپنے لاؤ ان قوتوں کو' کوئی قوت بھی تمہارے اختیار سے باہر نہ ہو۔طبعی قوانین کے متعلق میں عرض کر رہا ہوں' مومن کا مقام تو بہت بڑا ہے۔؟؟؟ یہ کتاب آئی تھی۔چین میں یہ دریائے زرد جو ہے اس کی طغیانیوں کا اور ہلاکت سامانیوں کا یہ عالم تھا عام طور پہ ہر سال برسات کے موسم میں اس کا پاٹ قریباً تیس میل تک چوڑا ہو جاتا تھا۔اور اس نے جب سے تاریخ بنی تھی اس ملک کی' کوئی سال امن سے گذرتا ہی نہیں تھا۔اس لیے کہ کوئی خاص متعین اس کا رخ نہیں تھا Banks نہیں تھے سواحل نہیں تھے۔وہ ہر سال اپنا رخ بدلتا تھا اور پھر اس قسم کا بپھرا ہوا دریا جب اپنی مرضی کے مطابق رخ بدلے تو اس کے بعد تو 'نہ ترا منزلے باشد نہ مرا' کوئی محفوظ ہی نہیں رہ سکتا تھا ملک میں۔Times Unkonwn سے یہ تباہیاں چلی آ رہی تھیں اس ملک میں اور اس قوم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ صاحب یہ ہمارا مقدر ہی ایسا ہے۔افیون زدہ قوم تھی۔اقتدار جب انہوں نے سنبھالا ہے کہ جنہوں نے فطرت کے قوانین کا مطالعہ کر کے اس کی قوتوں کو مسخر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو وہ بڑا Dramatic انداز ہے کہ جس میں ماؤزے تنگ نے جا کے وہاں سیلاب کے زمانے میں اس کا فقرہ ہے اس کی تقریر کا کہ ''دریائے زرد تم تاریخ انسانیت کی ابتداء سے من مانی کر رہے ہو اب بھی تمہاری یہ صورت ہے کہ تم کسی پابندی کے قائل نہیں ہو۔اس لیے کہ اب تک اس قوم کے اندر بھی کسی قانون اور ضابطے کی

پابندی نہیں ہوتی تھی۔ اب یہاں اقتدار اس قوم کے ہاتھ میں آیا ہے جو قاعدے اور ضابطے کی پابند ہے۔ زرد دریا! اس کے بعد تمہیں بھی قاعدے اور ضابطے کا پابند رہنا پڑے گا' آئندہ سال سے تمہیں ساحلوں کے اندر بہنا ہوگا ساحل سے باہر نہیں جا سکتے''۔ اور آئندہ سال دریائے زرد ساحلوں کے اندر بہتا تھا۔ اب وہ انسان کے مقرر کیے ہوئے راستے میں بہہ رہا ہے۔ انسان تو وہ بلا ہے۔ اس نے جہاں سے دریا نکلتا تھا اور جہاں جا کے گرتا تھا راستے میں جتنی آبادیاں تھیں ان کے حصے میں ٹکڑے کر دیے دریا کے اس حصے کے ایک ایک میل دو دو میل کے۔ ان کے ذمہ یہ لگا دیا کہ تمہاری روٹی کا ذمہ ہمارے اوپر ہے' تمہارا ذمہ یہ ہے کہ اس کے ساحل ایسے بنا دو کہ جتنا جی چاہے بپھر جائے توڑ نہ سکے ان کو۔ اور آئندہ برسات تک دریائے زرد کو لگام دیدی گئی عزیزانِ من!۔ اس میں ابھی ان اقدارِ سماوی پر ایمان کا ذکر نہیں آ رہا کہیں' صرف فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا ذکر آتا ہے جس کے لیے قرآن نے آدم کہا ہوا ہے مومن نہیں وہاں کہا ہوا۔ یہ مقامِ آدمیت ہے ابھی جہاں فطرت کی قوتیں اس کے تابع تسخیر ہوتی ہیں۔

ہر وہ متنفس جو آدمی کے مقام کے اوپر ہے ایسا کر سکتا ہے۔ ہم تو آدمی کے مقام کے اوپر بھی نہیں پہنچے۔ اور اسی لیے تو اس نے یہ کہا تھا دکھ بھری آواز میں اس قوم کو پکار کے کہ

بہ آدمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی

''او تو تے جے بندے دا پتر نئیں بنڑیاں تے رب دا مقرب بنن دے تے دعوے کرن ڈیا ہیں توں''۔ آدم کے مقام کے اوپر تو پہنچ اس کے بعد پھر بات کر خدا کی۔ آدمی کے مقام پہ نہیں پہنچا خدا کی بات کیا کر رہا ہے تو۔ کیا عجیب انداز تھا اس شخص کے کہنے کا۔ بہ آدمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی۔ لیکن ہمیں تو یہ خدا کے پرستار جو ہیں آدم کے مقام پہ پہنچنے ہی نہیں دیتے۔

جب کسی بیماری کی تشخیص ہی غلط ہو تو پھر اس کا علاج کیونکر ممکن ہے

جونہی یہ فطرت کی قوتیں' تباہیاں لائیں ہماری نگاہوں کا رخ انہوں نے دوسری طرف موڑ دیا۔ نہ ہمیں اپنی ذمہ داریاں یاد آنے دیں نہ ذمہ دار ارباب کی ذمہ داریاں ان کے سامنے لانے دیں۔ بتایا ہی نہ گیا کہ کن جرائم کی پاداش میں یہ ہو رہا ہے۔ گناہوں کا چرچا ہونے لگ گیا' توبہ اور استغفار کے معنی مسجدوں میں بیٹھ کے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کے تسبیح پھیرنے کا نام ہو گیا تا کہ ادھر ان کی توجہ ہی نہ آئے۔ نتیجہ یہ کہ ہر بار کا سیلاب پہلے سے زیادہ تباہیاں لانے والا بن گیا۔ کیا ہی یہ تھا ابلیسی سازش نے جو اقبالؒ کہہ گیا ہے کہ راج اس کا' وہ کہتا تھا کہ میں اس امت کی بیداری سے ڈرتا ہوں ابلیس نے کہا تھا اپنے مشیروں سے کہ ابلیس کے نقطۂ نگاہ سے حقیقی فتنہ جو ہے وہ مزدکیت فتنۂ فرد انہیں' اسلام ہے۔ ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں۔ تو انہوں نے یہ پوچھا تھا کہ پھر ہم کیا کریں کہ یہ امت بیدار نہ ہونے پائے مقامِ آدمیت پہ بھی نہ آنے پائے۔ اس نے کہا تھا کہ پروگرام اس کے لیے یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ارضی یا سماوی تباہ کاریوں کا علاج تسبیح کے دانوں کی بجائے کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے میں ہے

سیلاب آتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں تسبیحاں دیدو' انہیں یہ کہدو کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے آیا' جرائم کی طرف نگاہ نہ جانے دو۔ اس طرف نظر نہ اٹھنے دو کہ کس نے اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ قوم تباہ ہوگئی۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

ایک ایک مہرہ مات ہوتا چلا جارہا ہے عزیزانِ من! ۔ مشرقی پاکستان کی بساط پہ ہمارے مہرے جس طرح سے مات ہوئے تھے' یہاں آنے کے بعد جس طرح ایک ایک مہرہ مات ہورہا ہے۔

مملکتِ پاکستان کے متعلق ہندو ذہنیت کبھی نہیں بدل سکتی

عزیزانِ من! بھکاریوں کی قوم کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ اس 1971ء کی جنگ کے بعد کے عواقب میں جو کچھ ہمارے ساتھ آج ہورہا ہے' جس طرح سے وہاں وفد جارہے ہیں ہمارے' جس طرح سے یہ مذاکرات' مذاکرات کیا ہورہے ہیں جس طرح سے ہر بار ہم خود فریبی میں مبتلا ہوتے چلے جارہے ہیں۔ آج صبح کے اخبار میں یہ کچھ تھا جس سے تڑپ اٹھا تھا کہ اتنے لمبے چوڑے مذاکرات کے بعد بات پھر وہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ نہیں ہندو کی ذہنیت ہمیں کسی فیصلے کی طرف نہیں آنے دیتی ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے عزیزانِ من! ہندو کی ذہنیت۔ ہندو نے تو پاکستان بننے کے بعد جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی تھی کہ ٹھیک ہے آج جناحؒ کو یہ کچھ کر لینے دیجیے' کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگے گا کہ اس کے بعد ہم پھر اکھنڈ بھارت بنادیں گے۔ جن کے عزائم یہ ہوں ان سے ہم خیر کی توقع کرسکتے ہیں؟۔ عزیزانِ من! کسی سے بھی یہاں خیر کی توقع نہیں ہوسکتی اپنے ہی حسنِ عمل سے یہ چیز ہوسکتی ہے۔ اور پھر حسنِ عمل کے اندر فریب میں نہ آجایئے۔ قرآن نے پہلی بات کہی تھی کہ اپنی سرحدوں کو اتنا مضبوط رکھیے کہ تم یہاں بیٹھے ہو او رمخالفین کے دل وہاں کانپ رہے ہوں تمہاری وجہ سے۔ یہ کہا تھا اس نے۔ مومن کے متعلق یہ کہا تھا (و یقتلون و یقتل) مومن کی زندگی یہ ہے کہ اس حفاظت کے لیے وہ ہر وقت تیار ہوتا ہے میدانِ جنگ میں جانے کے لیے۔ وہاں دو ہی شکلیں قرآن نے بتائی ہیں تیسری شکل ہے ہی نہیں عزیزانِ من! یا وہاں وہ اپنی جان دیدیتا ہے یا غالب اور منصور واپس آتا ہے۔ اب بھی یہی چیز اس مسئلہ کو حل

کر سکے گی عزیزانِ من! آج بھی یہی ایک حل ہے کوئی دوسرا حل اس کا نہیں ہے۔(و یقتلون و یقتل)۔لیکن اس کے لیے تو قرآن نے شرط لگائی تھی کہ اس کے لیے اس انداز میں میدانِ جنگ میں لڑنا ہوگا پوری قوم کو۔ وہاں تو سپاہی الگ ہوتا ہی نہیں ہے۔

میدانِ جنگ میں مومن کی سراپا زندگی سیسہ پلائی دیوار کی مانند ہوتی ہے

قرآن کی رو سے تو ہر مسلمان سپاہی ہوتا ہے۔ان کے لیے کہا تھا(؟؟ مرصوس)قوم کو یوں ہونا چاہیے جیسے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔اینٹ کی بھی دیوار نہیں کہ دو دیواروں کے اندر تھوڑا سا یونہی رخنہ ہوتا ہے۔جیسے سکہ ڈھال کے ایک دیوار بنائی ہوئی ہو عزیزانِ من! یہ مثال تھی قرآن میں۔قوم کے اندر اس قسم کی باہمی (فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ) دلوں کی دیواریں اس طرح سے ملی ہوئی ہوں پوری قوم کے اندر۔اور پھر ایک ہی زندگی کا مقصد ہو یا وہاں سے غالب اور منصور لوٹنا ہے یا جان دیدینی ہے۔عزیزانِ من! وہاں آپ ایک ہندو کہہ رہے ہیں۔ایران اور روما جیسی طاقتیں مٹھی بھر عربوں کا ایک میدان میں مقابلہ نہ کر سکیں۔لیکن یہ جو آفتیں آتی ہیں ان کا علاج عزیزانِ من! یہ علاج ہوگا کہ ہر وقت Vigilance رہے۔کوئی اور نہیں مارتا عزیزانِ من! (وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ) قرآن کہتا ہے جو مصیبت تم پہ آتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔مصیبت آئے تو ڈھونڈو ان ہاتھوں کو جن کی وجہ سے وہ مصیبت آئی ہوئی ہوتی ہے۔

آخر پر علامہ پرویزؒ کی ایک دردمندانہ اور حقائق پر مبنی اپیل

یہ ہے عزیزانِ من! میرا آج کا پیغام۔اور پھر دہرا دوں ہم جو بچ گئے ہیں ان مصیبتوں سے ان کے لیے جو ابھی سانس لے رہے ہیں ان آفتوں کے اندر۔ان کے لیے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے ہم کریں اور اس انداز سے کریں کہ ان کو اس کا احساس نہ ہونے پائے کہ ہمیں خیرات دی جا رہی ہے۔ان کی طبعی زندگی کو بچانے کے لیے ان کی انسانی زندگی کی موت جو ہے اس کو نہ خریدنے دیجیے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے۔بات میں نے درس کی اس آیت سے شروع کرنی تھی لیکن آج اس موضوع سے زیادہ موزوں موضوع ہو نہیں سکتا۔اور آج کیا ابھی تو پتہ نہیں ہمیں کب تک یہ چیزیں جو ہیں یہ دہرانی پڑیں گی۔یا اللہ! ہمیں وہ نگاہ دیدے کہ ہم ایسے اوقات میں ان اسباب کو دوسروں کی طرف تلاش کرنے کی بجائے اپنے ہاں تلاش کیا کریں۔دوسروں کو ذمہ دار قرار دینے کے لیے ہم خود سوچا کریں کہ ہم کس قدر ذمہ دار ہیں۔پھر توفیق دیدے کہ اس کے بعد ہم یہ چیز عزم کریں اس بات کا کہ اس دفعہ یہ ہو گیا ہے اس کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

☆.....☆.....☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

منظور حسین لیل۔ بھکر

دین کی تبدیلی، مذہب میں

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۳)۔اس ثنویت کے نتیجہ میں، امت میں مذہبی تفرقہ پیدا ہوگیا اور امتِ واحدہ رہنے کی بجائے شیعہ۔سنّی۔حنفی۔ مالکی۔ شافعی۔حنبلی وغیرہ فرقوں میں بٹ گئی۔

(۴)۔فرقوں سے آگے بڑھے تو ان میں نسلی تفریق نے سر ابھارا۔۔عربی۔ایرانی۔تورانی۔منگولی۔افغانی وغیرہ۔۔پھر نسلی امتیازات مزید شاخوں میں تقسیم ہوکر، سید۔پٹھان۔راجپوت۔شیخ۔اعوان، برادریاں وجود میں آگئیں۔

(۵)۔اور آخر میں یہ کہ مغربی تصورِ قومیت سے متاثر ہوکر، اشتراکِ وطن کو معیارِ قومیت بنالیا گیا۔اور اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے امتزاج سے ایک قوم وجود میں آگئی۔۔۔آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں، حقیقی اسلام، یعنی دین، کا کوئی ہلکا سا پرتو بھی اس امت میں باقی رہ گیا تھا؟۔حقیقت یہ ہے کہ ہم رفتہ رفتہ اُسی مقام پر آگئے تھے جس مقام پر، ظہورِ اسلام کے وقت سابقہ اہلِ کتاب تھے۔ان کے ہاں، دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا اور باہمی اختلافات وتفریقات سے ان کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی تھی۔۔۔بعینہٖ یہی حالت ہماری ہو چکی تھی۔کہا جائے گا کہ اُن لوگوں کے پاس، خدا کی کتاب۔۔یعنی ضابطۂ ہدایت۔۔اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہی تھی لیکن ہمارے ہاں وہ بالکل محفوظ تھی۔

یہ ٹھیک ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس کتاب کا ہمارے ہاں مصرف کیا رہ گیا ہے!۔ظاہر ہے کہ کتاب کوئی تعویذ تو نہیں کہ اسے کپڑے میں لپیٹ کر یا چاندی میں منڈھا کر گھر میں رکھ لیا جائے تو گھر جملہ آفات سے محفوظ ہو جائے۔کتاب کی موجودگی سے مراد یہ ہے کہ وہ ہماری زندگی کے لئے ضابطہ قرار پائے اور ہم اس کے مطابق اپنے مسائل کو حل کریں۔اگر کتاب کی یہ حقیقت نہ رہے تو اس کی موجودگی صرف ''حصولِ ثواب'' کے لئے رہ جاتی ہے۔اور اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو کتاب کی موجودگی اور عدم موجودگی سے عملاً کچھ فرق نہیں پڑتا۔سابقہ اہلِ کتاب، اپنے فیصلے، انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے مطابق کرتے تھے۔ہم بھی اپنے فیصلے انسانوں ہی کی بنائی ہوئی شریعت کے مطابق کرتے ہیں۔لہٰذا، جب تک یہ صورتِ حال باقی رہے، کتاب کا ہونا یا نہ ہونا، یکساں ہوتا ہے۔۔۔بلکہ

ہمارے ہاں تو یہ حالت ہے کہ جو شخص، کتابِ خداوندی کو عملاً وجود میں لانے کی بات کرتا ہے، اس پر کفر کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں، کیونکہ اس سے مذہبی پیشوائیت کے قصرِ اقتدار میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے۔''

اسلام مذہب بن گیا:۔ طلوعِ اسلام مئی ۱۹۸۱ء صفحہ نمبر ۲۵:۔ ''دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے جب کہا کہ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (22:52)۔ ''اے رسول علیہ السلام! تجھ سے پیشتر کوئی صاحبِ وحی ایسا نہیں ہوا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔ اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحبِ حکمت ہے۔'' رسول کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و اقدارِ خداوندی کو معاشرہ میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق تھا جو بندگی، پرستش یا مختلف رسوم کی رو سے انفرادی طور پر قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابتداء میں دین ہی تھے۔ (قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں رسول بھیجے تھے)۔ مفاد پرست گروہوں نے جن کے سرکردہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔

مذہب بطور پیشہ:۔ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ: يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ..... (2:79)۔ ''یہ خود شریعت وضع کرتے اور لوگوں سے کہتے کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے۔ اور ایسا کچھ پیسے کمانے کے لئے کرتے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا۔'' خدا نے رسول اللہ علیہ السلام کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہہ دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ..... (6:116)۔ ''خدا نے اس وحی کی رو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔'' اس لئے کہ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ ''ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔''

ختمِ نبوت:۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختمِ نبوت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ اس کا یہی کلام (قرآن مجید) ہوگا۔۔۔ لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا، وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو

قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہوگیا؟۔ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟۔ کیا اس میں بھی آمیزش ہوگئی؟۔ اگر ایسا ہوگیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لی تھی؟۔ نہیں!۔ ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیر و تبدل ہوا، نہ کسی قسم کی آمیزش!۔ لیکن ہوا یہ کہ خارج از قرآن متعدد عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی۔ اور اس طرح دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دین نہیں، بلکہ وہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہوجانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ اُمت میں وحدت نہیں رہتی، وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری سند (خدا کی بجائے) کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پا جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے (۳۰/۳۱)۔۔۔ (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) جب دین، مذہب میں تبدیل ہوجاتا تھا، تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختمِ نبوت کے بعد، نبیوں کا سلسلہ بند ہوگیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد، خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہوسکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبی کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔

استحکامِ آیات:۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی منزہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآنی الفاظ میں) ''محکم'' کیا جائے۔ (ثم یحکم اللہ آیاتہ)۔ آیاتِ قرآنی کو ''محکم'' کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق و باطل، جائز و ناجائز، صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ فریضہ انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ اُمت کا اجتماعی فریضہ تھا۔ جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کا جملہ کاروبار، قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ کتبِ سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔''

☆.....☆.....☆

دین اور مذہب کا عملی فرق:۔ طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۱ء۔ ص۔ ۲۶: ''تقسیمِ ہند سے پہلے ہم ہندوستان میں تھے تو ہمیں پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس آزادی کا اعلان تو ملکہ وکٹوریہ نے اپنے منشور میں کر دیا تھا۔ ہندو بھی اس کا وعدہ کرتا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد مسلمانوں کو بدستور مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ نیشنلسٹ علماء جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں ہندو کے ہمنوا تھے، اپنے مسلک کے جواز میں دلیل یہی پیش کرتے تھے کہ جب مسلمانوں کو، ہندوستان میں

رہتے ہوئے، مذہبی آزادی حاصل رہے گی تو پھر ایک الگ مملکت کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ان کی یہی وہ دلیل تھی جسے رد کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ تصور، کہ اسلام نماز، روزے، حج، زکواۃ یا شخصی قوانین کا نام ہے، اسے امورِ دنیا سے کوئی واسطہ نہیں، ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ تھا۔ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں، مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت کا تصور پیش کیا تھا تو اس کے لئے بنیادی دلیل یہ دی تھی کہ اس طرح، اُس اسلام کی جگہ جو ہمارے دورِ شہنشاہیت کا وضع کردہ ہے، ہم حقیقی اسلام کو از سرِ نو زندہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' ''ہندو کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ مسلمانوں کو نماز روزہ، حج، زکواۃ کی آزادی حاصل رہے۔لیکن وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اسلام، ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے پھر سے زندہ ہو جائے۔اس میں اسے موت دکھائی دیتی تھی۔اور یہی وجہ اس کی انتہائی مخالفت کی تھی۔''

غیر قرآنی مملکت:۔ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۷۶ء۔ص۔۱۳:۔'' کچھ عرصہ بعد، خلافت، ملوکیت میں بدل گئی، یعنی وہ قرآنی حدود کی پابند نہ رہی۔ میں اس مقام پر یہ بحث نہیں چھیڑنا چاہتا کہ یہ کیسے ہوا اور اس کا ذمہ دار کون تھا۔ میں اسے اپنی کتاب ۔۔شاہکارِ رسالت۔۔ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ اس کا مطالعہ فرمالیں۔۔۔اس (غیر قرآنی) نظامِ حکومت میں دین (اسلامی نظام) کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔۔یعنی مذہب اور سیاست میں۔۔مذہب سے مفہوم رہ گیا، نظری عقائد اور عبادات (نماز، روزہ وغیرہ) اور پرسنل لاز (نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق امور)۔حکومت نے انہیں مذہبی علماء کی تفویض میں دے دیا۔اور امورِ مملکت۔۔ پبلک لاز۔۔ اپنے ہاتھ میں رکھ لئے۔اس طرح سلاطین اور مذہبی پیشواؤں کے دو الگ الگ دوائرِ اقتدار وجود میں آ گئے۔اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری بھی پھر سے زندہ ہو گیا۔چونکہ اس نظام (دین) کی مرکزی اتھارٹی باقی نہ رہی، اس لئے ایک طرف مذہبی فرقے پیدا ہو گئے اور دوسری طرف مسلمانوں کی مختلف سلطنتیں وجود میں آ گئیں۔اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ نہ ایک امت رہی، نہ ان کا ایک ضابطہء قوانین، نہ ایک مملکت رہی، نہ ایک اتھارٹی۔ یہ ہیں وہ نقوش، جو علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ''عربی شہنشاہیت'' نے اسلام پر ثبت کر دیئے۔اور جن کی وجہ سے وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں باقی نہ رہا۔انہی غیر اسلامی نقوش کو مٹا کر، اسلام کو پھر سے اس کی حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور پیش کیا۔اسے نظریہء پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یعنی وہ مملکت جس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔۔۔اسلام پر ان غیر اسلامی نقوش کے ثبت کرنے اور اور انہیں قائم رکھنے کے ذمہ دار یہ تین عناصر ہیں:۔(۱)۔نظامِ ملوکیت۔(۲)۔نظامِ مذہبی پیشوائیت، جس میں اربابِ

شریعت (ملّا) اور اصحابِ طریقت (صوفی) دونوں شامل ہیں۔اور (۳)۔نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار۔۔علامہ اقبالؒ کی ساری زندگی ان عناصر کے خلاف جہاد میں بسر ہوگئی۔ان کا سارا کلام ان پر تنقید اور ان کی تردید کا آئینہ دار ہے۔یہ تو ان عناصر کا تجزیہ ہے۔لیکن اگر سمٹا کر دیکھا جائے تو اقبالؒ کا مشن درحقیقت اس نظام کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا تھا جسے دورِ حاضر میں سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو اس وقت ساری دنیا میں رائج ہے۔اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی کوئی تخصیص نہیں کی۔اس نظام میں، حقِ حکومت (یعنی قانون سازی کا اختیار) انسانوں کو حاصل ہوتا ہے (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) اور مذہب کے متعلق کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ جس کے جی میں جو آئے کہے اور جو دل چاہے کرے۔حکومت اس میں دخل نہیں دیتی۔بلکہ اسے ''مذہبی آزادی'' کہہ کر، مذہب پرست طبقہ کے سر پر اپنا عظیم احسان دھرتی ہے۔''

موروثی بادشاہتیں:۔طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۸۲ء۔صفحہ نمبر ۴۹:۔''دین کا تمکن، قرآنی نظامِ مملکت کے ساتھ مشروط اور وابستہ ہے۔یہ نظام نہ رہے تو معاشرہ میں دین کا وجود ہی نہیں رہتا۔جب قرآنی نظامِ حکومت کی جگہ ملوکیت آگئی (واضح رہے کہ ہر وہ حکومت جو اُمت کے مشورے کی بجائے قوّت کے بل بوتے پر قائم کی جائے، ملوکیت کہلائے گی۔اور جب وہ موروثی طور پر آگے چلے تو وہ ملوکیت کی بدترین شکل ہوگی۔جب مسلمانوں میں اس قسم کی حکومت قائم ہوگئی) تو ''دین'' باقی نہ رہا۔اس کی جگہ ''مذہب'' نے لے لی۔اس کے بعد تاریخ کے اس پورے دور میں (یعنی اس زمانے سے لے کر آج تک) ''مسلمانوں کی حکومتیں'' تو قائم ہوتی رہیں لیکن ''اسلامی حکومت'' کہیں بھی قائم نہ ہوئی۔ملوکیت نے سب سے پہلے ثنویت کی طرح ڈالی یعنی امورِ مملکت (جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں پبلک لاز کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین (پرسنل لاز) اربابِ مذہب کی تحویل میں دے دیئے۔۔مسلمان بادشاہ، امورِ مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام دے دیا کرتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ ''اسلامی حکومت'' قائم ہے۔اس تاثر کو ہمارے علمائے کرام کی تائید اور بھی تقویت پہنچاتی تھی۔وہ ان موروثی بادشاہوں کے حق میں محراب و منبر سے: ایداللہ بنصرہٖ۔اور۔خلداللہ ملکہٗ۔کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔انہیں۔''ظل اللہ علی الارض''۔''زمین پر خدا کا سایہ'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ملوکیت کے اُس ماحول میں امورِ مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہوا کرتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتویٰ سے لگا لیجئے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب (ہدائیہ اولین مجیدی۔صفحہ نمبر ۴۹۳) میں ان الفاظ میں درج ہے:۔کل شیء صنعہ الامام الذی لیس فوقہ امام فلا حد علیہ الا قصاص۔یعنی جن جرائم کی سزا حد ہے، سربراہِ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا بجز قصاص کے۔یعنی سربراہِ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پر ''حد'' نہیں لگ سکتی۔''

ملوکیت میں کیا ہوا:۔طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۸ء۔ص۔۱۶۔''وہ نظامِ مملکت جسے حضور نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا تھا، اس

وقت تک قائم رہا جب تک قرآن کی حکمرانی رہی۔اس کے بعد خلافت، ملوکیت میں بدل گئی۔یعنی مملکت میں قرآن کی حکمرانی نہ رہی۔ ملوکیت میں:۔(۱)۔سب سے پہلی تبدیلی یہ ہوئی کہ امت میں ثنویت (Dualism) پیدا ہوگئی۔یعنی دنیاوی امور الگ ہوگئے اور ''مذہبی امور'' الگ۔بالفاظِ دیگر، پبلک لاز اور پرسنل لاز الگ الگ ہوگئے۔ پبلک لاز مملکت کی تحویل میں رہے اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کے حیطہء اقتدار میں آگئے۔اس طرح امت میں دو متوازی نظامہائے اقتدار وجود میں آگئے۔(۲)۔پبلک لاز حکمرانوں کی مصلحت، منشاء اور مرضی کے مطابق مرتب ہونے لگے اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کی منشاء کے مطابق۔ان میں عقائد، عبادات، مذہبی شعائر اور مناسک بھی شامل تھے۔اس سے مختلف مذہبی فرقے وجود میں آگئے۔اور ہر فرقہ کا الگ الگ ضابطہء شریعت بن گیا۔اسے فقہ کہا جاتا ہے۔اس طرح امت کی عملی زندگی میں قرآن باقی نہ رہا۔حصولِ ثواب کے لئے اس کی صرف تلاوت باقی رہ گئی۔عصر حاضر میں اس قسم کی مملکت کو سیکولر اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔بالفاظِ دیگر، قرآن کی حکمرانی کے بعد، مسلمانوں میں سیکولر نظام رائج ہوگیا۔اور یہ نظام مسلمانوں کی تمام مملکتوں میں اب تک رائج چلا آرہا ہے۔واضح رہے کہ اگر کسی مملکت میں بعض جرائم کی سزائیں احکامِ قرآنی کے مطابق دی جائیں تو اس سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ بھارت میں جرمِ قتل کی سزا موت ہے جو قرآن کے مطابق ہے۔لیکن اس سے بھارت کی حکومت، اسلامی تو نہیں بن جاتی۔اسلامی مملکت یا حکومت صرف وہ کہلاسکتی ہے جس میں زندگی کے تمام گوشوں پر قرآن مجید کی حکمرانی ہو۔(۳)۔اس ثنویت کی رو سے، اسلام صرف اعتقادات اور پرسنل لاز کا نام رہ گیا۔یعنی اس شعبہ کا نام جو مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں تھا۔چونکہ یہ شعبہ حکومت سے الگ تھا اس لئے تصور یہ پیدا ہوگیا کہ اسلام پر کاربند ہونے کے لئے مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت یا مملکت کا ہونا لازمی نہیں۔اسلام پر ہر اس حکومت میں کاربند رہا جاسکتا ہے جو مسلمانوں کو (نماز، روزہ وغیرہ کی) مذہبی آزادی دے دے۔(مثلاً) ہندوستان میں، انگریزوں نے مسلمانوں کو ''مذہبی آزادی'' دے دی تھی۔اس لئے وہاں ہماری مذہبی پیشوائیت مطمئن تھی کہ اسلام پر کاربند ہونے میں کوئی امر مانع نہیں۔اس تصور کے راستے میں آیہء استخلاف سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

روحانی خلافت:۔اس کی تاویل یوں کر لی گئی کہ اس سے مراد ''روحانی خلافت'' ہے۔دنیاوی سلطنت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔اسی قسم کی معنوی تحریف، دین کی دیگر اصطلاحات میں بھی کر لی گئی۔دین میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد تھی مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین۔لیکن اب اس کا مطلب وعظ ونصیحت رہ گیا۔یہی صورت دین۔۔قرآنی مملکت۔۔ کے دیگر ارکان، صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ کے ساتھ ہوئی۔قرآن کریم نے واضح طور پر کہا تھا کہ:۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا

الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41)۔ ''یہ وہ لوگ ہیں (یعنی مومنین) کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلواۃ اور ایتائے زکواۃ کا نظام قائم کریں گے۔ اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور ان کی مملکت میں تمام امور، قانونِ خداوندی کی رو سے سرانجام پائیں گے۔''۔ اس آیت سے واضح ہے کہ اقامتِ صلواۃ۔ ایتائے زکواہ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے تمکن فی الارض۔ اپنی آزاد مملکت۔۔ کی لازمی شرط تھی۔ یعنی یہ امور ایسے تھے جو صرف اپنی آزاد مملکت میں سرانجام دیئے جا سکتے تھے۔ لیکن جب ان اصطلاحات کا مفہوم محض نماز پڑھنا، زکواۃ (خیرات) دینا اور وعظ کہنا لے لیا گیا تو ان کے لئے اپنی آزاد مملکت کی موجودگی ضروری نہ رہی۔ ان پر، غیر مسلموں کی حکومت میں بھی عمل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزوں نے مسلمانوں کو ''مذہبی آزادی'' دے رکھی تھی۔ اور وہاں کی ہندو حکومت میں آج بھی مسلمانوں کو یہ آزادی حاصل ہے۔ اور ہماری مذہبی پیشوائیت اُس وقت بھی مطمئن تھی اور آج بھی مطمئن ہے کہ وہاں اسلام پر عمل پیرا ہونے میں کوئی امر اُس وقت مانع تھا نہ آج مانع ہے۔ جب اقامتِ صلواۃ سے مراد صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکواۃ کا مفہوم غریبوں کو چند پیسے بطور خیرات دے دینا رہ جائے تو ان کے لئے واقعی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔ اس طرح اسلام، جو ایک دین تھا، مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ اسلامی مملکت (یا خلافت) کی جگہ مسلمانوں کی مملکتوں نے لے لی جن میں سیکولر نظام رائج ہوگیا۔ اور ہمارے مناظر اس ''جہاد'' میں مصروف ہوگئے کہ اسلام کو جملہ ''مذاہبِ عالم'' میں سے افضل ''مذہب'' ثابت کر دیا جائے۔ اور جب غیر مذاہب کے ساتھ مناظروں کی گنجائش نہ رہے تو خود اپنے فرقوں میں مناظرہ بازی اور کفر سازی کی مہم شروع کر دی جائے۔''

☆.....☆.....☆

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآنِ مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

سی ڈی اور کتب کی خریداری

WWW.TOLUISLAM.COM

☆ اندرون ملک، فون: 35753666 42 92+، ای میل: trust@toluislam.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تیسری قسط

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

نظریۂ اِرتقاء

Special Creation v/s Evolution

قرآنِ حکیم نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا ایک اہم مقصد بتایا ہے کہ آپؐ ان زنجیروں کو توڑ دیں گے جن میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آ رہی ہے اور ان بوجھوں کو اتار پھینکیں گے جن کے نیچے انسان کی کمر دہری اور اس کی قدرتی صلاحیتیں دبی ہوئی ہیں 7:157۔ ظاہر ہے یہ محکومی اور غلامی کے وہ اغلال وسلاسل ہیں جنہوں نے انسانی جسم کے ساتھ اس کی حریتِ فکر اور آزادیٔ عمل کو چاروں طرف سے جکڑا ہوتا ہے۔ قرآن پاک اس استبداد کو نوعِ انسانی کے خلاف بہت بڑا جرم قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید کی دعوتِ انقلاب کی غایت یہ ہے کہ تقلید وتوہم پرستی، غلامی اور محکومی جیسی لعنت کو مٹا کر ایسا نظام نافذ کیا جائے جس میں مناسب تعلیم وتربیت سے انسان کی خداداد صلاحیتوں کو اُبھرنے، بڑھنے، پھلنے اور پھولنے کا پورا موقع مل سکے تاکہ وہ حدود اللہ کا پاس رکھتے ہوئے اپنی سعی وکاوش سے جتنا بلندیوں تک جا سکے۔ چلا جائے۔ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ ''لہٰذا جو لوگ نبیؐ کی نبوت پر ایمان لے آئیں اور اس کے پیش کردہ پروگرام کے مخالفین کے لئے روک بن جائیں اور اس کی مدافعت کریں۔ اس نظام کے قیام میں اس کی مدد کریں اور اس مقصد کے لئے اس روشنی کو اپنے لئے چراغِ راہ بنائیں جسے اس رسولؐ کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی اور جو کامیاب وکامران زندگی بسر کریں گے 7:157۔

نبی آخرالزمانؐ کی بعثت کے وقت، ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ داری، نسل پرستی اور قومیت جیسے استعداد وبربریت پر مبنی اداروں کی طرح غلامی جیسا انسانیت کش ادارہ بھی موجود تھا جس کی جڑیں ماضی میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ قدیمی ہندوستان، مصر، یونان اور دیگر بڑی بڑی تہذیبوں میں اس کے خون آشام پنجے گڑے ہوئے تھے۔ افلاطون وارسطو جیسے حکماء غلامی کو معاشرے کا لازمی جزو سمجھتے تھے۔ یہی حال جزیرہ نما عرب کا بھی تھا۔ شہروں اور بازاروں میں غلام لونڈیوں کی منڈیاں لگتی تھیں جہاں عام جنس (Commodity) کی طرح انسانوں کی خرید فروخت ہوتی تھی۔ انسانی رسوائی وتذلیل کے ایسے ماحول میں اس اعلان نے لوگوں کو حیران ہی نہیں بلکہ پریشان کر دیا کہ آگاہ رہو ''خالق کائنات نے انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے''۔ 17:70۔ یعنی انسان محض فرزند آدم ہونے کی حیثیت سے قابل عزت ومستحقِ احترام ہے۔ غلامی کی یہ ذِلت ورسوائی کی تجارت عام طور پر، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا، شہروں اور

بازاروں میں ہوتی تھی۔ لیکن غلاموں اور لونڈیوں کا سرچشمہ جنگ کے قیدی تھے۔ بھلا جس قرآن کا پیغام شرفِ انسانیت' اور جس کی دعوت احترامِ آدمیت پر ہو وہ غلامی جیسی ننگِ انسانیت اور بدترین لعنت کی زنجیروں کو کس طرح روا رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے پہلے تو ان غلاموں اور لونڈیوں کے کشود کی راہ نکالی جو اس وقت عربوں کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ قرآن پاک نے مناسب احکامات کے ذریعے ایسا طریق عمل اختیار کیا جس سے وہ آہستہ آہستہ اس آزاد معاشرے میں جذب ہوتے چلے گئے۔ ان کے حقوق متعین کر دیئے گئے اور ان سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا تاکہ وہ انسانی مراعات سے محروم نہ رہنے پائیں۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جس قدر احکام ہیں وہ ماضی میں بنائے گئے انہی غلاموں اور لونڈیوں کی بابت ہیں جو اس وقت موجود تھے۔ آئندہ کے لئے غلام لونڈیاں بنانے کی کہیں بھی اجازت تو کیا اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ ان کا ذکر جہاں بھی آیا ہے ''ماملکت ایمانکم'' یعنی ماضی کے صیغے میں آیا ہے۔

قرآن پاک نے اس بارے میں دوسرا کام یہ کیا کہ آئندہ کے لئے غلامی کی بنیاد ہی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ یعنی جنگی قیدیوں کو غلام لونڈیاں بنانے کی ممانعت کر دی۔ سورۂ محمدؐ میں ہے۔ ''جب تمہارا مقابلہ کفار سے ہو تو انہیں تہ تیغ کرو یہاں تک کہ جب ان میں مقابلے کی طاقت باقی نہ رہے تو بقیۃ السیف لوگوں کو گرفتار کرلو اور لڑائی جب ختم ہو جائے تو انہیں یا تو فدیہ لے کر یا احسان رکھ کر چھوڑ دو'' 47:4' 38:38۔ قرآن پاک نے اس حکم کے تحت آئندہ قیامت تک غلامی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ لیکن دنیا کی اکثریت نے اسے ماننے سے انکار کر دیا ان کا خیال تھا کہ غلامی کے بغیر معاشرے کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ ستم یہ ہوا کہ دنیا کی دیکھا دیکھی' خلافت کے خاتمے کے بعد خود مسلمانوں نے اس لعنت کو پھر اپنا لیا۔ یہ کیسے ہوا' یہ ایک طویل داستان ہے۔ میں یہاں اس کی صرف ایک مثال دوں گا۔ ہماری تاریخ و روایات کی کتابوں میں کئی روایات ایسی ہیں جن کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جنگی قیدیوں کو خلفاء راشدین کے زمانے میں بھی غلام لونڈیاں بنایا جاتا تھا جو قرآنی حکم کے صریحاً خلاف ہے۔ مقصد اِن خود ساختہ روایات کو پیش کرنے کا یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں غلامی کو جائز قرار دیا جائے' چاہے اس کی زد میں خلفاء راشدین بھی کیوں نہ آ جائیں۔ انہی روایات میں ایک روایت ایران کی شہزادیوں کے متعلق ہے۔ اس روایت میں کہا گیا ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو شہنشاہ ایران کی تین جوان بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے انہیں عام لونڈیوں کی طرح بازار میں بیچنے کا حکم دیا لیکن حضرت علیؓ نے خاندانِ شاہی سے ایسا سلوک کرنا جائز نہ سمجھا اور ان کو اپنے اہتمام میں لے کر ایک امام حسینؓ کو ایک محمد بن ابوبکرؓ کو اور ایک عبداللہ بن عمرؓ کو دے دی۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی مشہور و معروف کتاب ''الفاروق'' میں مضبوط دلائل کے ساتھ اس واقعے کی سختی سے تردید کی ہے۔

علامہ شبلی کے مطابق اس واقعہ کو زمخشری اور ابن خلکان نے بیان کیا ہے ''لیکن یہ محض غلط ہے''۔ کیونکہ زمخشری کے سوا طبری' ابن الاثیر' یعقوبی' بازری' ابن قتیبہ وغیرہ نے اس واقعہ کو نقل نہیں کیا۔ دوسرا یہ کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں خاندانِ شاہی پر مسلمانوں کو مطلق

قابو نہیں ہوا تھا۔ تیسرا یہ کہ شہنشاہ ایران یزدگرد ہر جگہ اپنی شکست سے بہت پہلے اپنے خاندان کو دوسرے شہروں میں بھیج دیتا تھا۔ مثلاً ایران کے پایۂ تخت مدائن میں لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنے خاندان کو حلوان بھیج دیا تھا۔ وہاں سے بالترتیب رے، اصفہان، کرمان، خراسان، بلخ اور آخر میں خاقانِ چین کے دارالحکومت فرغانہ میں خاندان کے ساتھ چلا گیا تھا جہاں ''حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت تک قیام پذیر رہا۔ چوتھا یہ کہ حضرت حسینؓ کی عمر اس وقت صرف بارہ سال تھی۔ پانچواں اور سب سے اہم یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں پے در پے شکست کے بعد پوران دخت کو تخت سے اتار کر ایرانیوں نے سولہ برس کے نوجوان کو تخت نشین کیا۔ علامہ شبلی کے مطابق سولہ سال کی روایت ابوحنیفہ دینوری کی ہے۔ طبری کے مطابق اس وقت یزدگرد کی عمر 21 سال تھی۔ ایک سترہ سال یا اکیس سال کے جوان کی ایک نہیں تین جوان بیٹیاں دریافت کرنا واقعی ایک کرامت ہے۔

بات غلامی کی ہو رہی تھی۔ دنیا نے امتناعِ غلامی کے قرآنی حکم کو نہ مانا جس کے نتیجے میں صدیوں تک انسانیت، سبعیت و بربریت کے آہنی پنجوں میں تڑپتی پھڑکتی اور بلبلاتی رہی۔ مسلمانوں پر تو زوال آ گیا تھا مگر مغرب میں نام نہاد ''جدید دور'' کے بعد بھی غلامی کی منڈیاں عروج پر تھیں۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی عیسوی میں امریکہ سیاہ فام غلاموں اور لونڈیوں کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ ظلم و ستم کا برہنہ رقص دیکھ دیکھ کر آخر کار کچھ پاکیزہ خیالات کے حامل سفید فام امریکیوں کے دل بھی پسیجنے شروع ہو گئے جس کے نتیجے میں 4 جولائی 1776ء کو ورجینا کے جفرسن کے مرتب کردہ اعلانِ آزادی کی منظوری دے دی گئی۔ اس معاہدے میں جان لاک کے عمرانی معاہدے (SOCIAL CONTRACT) کے نظریے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا تھا۔ ''ہمارے نزدیک یہ سچائیاں اظہر من الشمس ہیں کہ تمام انسان برابر پیدا کئے گئے ہیں، جنہیں ان کے خالق نے بعض ناقابل تنسیخ حقوق بخشے ہیں جن میں زندہ رہنے، آزادی و مسرت اور آسودگی کا حصول شامل ہے۔ ان حقوق کے حصول کے لئے لوگوں پر مشتمل حکومتیں قائم کی جائیں''۔ 1786ء میں امریکہ کے پہلے صدر جنرل واشنگٹن نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''میری دِلی خواہش ہے کہ کوئی ایسا منصوبہ اختیار کیا جائے جس کے ذریعے غلامی بتدریج، یقینی اور غیر محسوس طور پر ختم کر دی جائے''۔ غلامی ختم ہونے کے بعد بھی بڑے عرصے تک سیاہ فام امریکنوں کے ساتھ امتیازی سلوک جاری رہا جسے 1945ء میں سب سے پہلے ایک سیاہ فام خاتون روزا پارکس نے بس میں سفید فاموں کے لئے مخصوص سیٹ پر بیٹھ کر توڑا تھا۔ صدر اوبامہ کو اس قابلِ تکریم دلیر خاتون کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ 'B.B.C' کی ایک رپورٹ کے مطابق ہمارے ہاں بھی ایک ایسی ہی باجرأت، دلیر اور انتہائی معزز سندھی خاتون نے اپنے حلقے سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہے ان کا نام میں نہیں جان سکا اور اب شاید خواہش کے باوجود جان بھی نہ سکوں۔ کیونکہ ہمارے ہاں کے میڈیا کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی کوریج سے فرصت نہیں اور میرے لئے انتہائی قابل احترام اس خاتون کا تعلق ہاری خاندان سے ہے جو ابھی حال ہی میں کسی جاگیردار کی جبری مشقت سے رہا ہو کر آئی ہیں۔ میری دعا بھی ہے اور خواہش بھی کہ امریکی خاتون روزا پارکس کی

طرح یہ خاتون بھی ہمارے ہاں کے پسے اور کچلے ہوئے طبقے کے لئے مشعل راہ ثابت ہو۔ آمین

انسان اور زمین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب تک بطلیموس اور اس کے پیش رَووں کی زمین مرکز والی "Geo Centric Cosmology' کا تصور باقی رہا تو یہ دونوں بڑے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ لیکن جب سے اس تصور کی جگہ سورج مرکزی (Hilio Centric) کا تصور سامنے آیا ہے اس وقت سے زمین اور انسان دونوں اپنے اعلیٰ مقام سے گر چکے ہیں اب یہ بے وقعتی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ اسٹیفن اور برٹرینڈ رسل بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات خود ان حضرات کی تحریروں کے مطابق بھی دُرست نہیں لگتی۔ انسان کی طرح اللہ تعالیٰ نے زمین میں بھی کچھ ایسی منفرد خصوصیات رکھی ہیں جن کی وجہ سے یہ جہاں بھی ہوں گے انسان کی باقی جاندار مخلوق سے اور زمین کی باقی کائنات سے امتیازی خصوصیت برقرار رہے گی۔ سوائے ان سیاروں کے جہاں زندگی ممکن یا موجود ہو۔ جناب یحییٰ کا ایک مضمون میری نظر سے گذرا تھا جس میں انہوں نے زمین کی تخلیق کے سائنسی ثبوت دیئے ہیں۔ زمین اور ہمارے نظام شمسی کے بارے میں اچھی معلومات دی گئی ہیں مگر خود یحییٰ صاحب کے موقف کے خلاف ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری زمین بتدریج ارتقائی مراحل سے گذر کر موجودہ شکل میں آئی ہے۔ ان کا کہنا بالکل درست ہے کہ ''زندگی صرف اور صرف اسی وقت وجود میں آ سکتی ہے جب موزوں ترین حالات اور عناصر بیک وقت دستیاب ہوں''۔ یہی بات تو ارتقاء کے قائل لوگ بھی کہتے ہیں۔ بلکہ وہ اس حقیقت کو ارتقاء کے حق میں ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ تدریجی ارتقاء کے ذریعے ہی یہ موزوں ترین حالات اور عناصر ظہور پذیر ہوئے ورنہ ابتداء میں یہ زمین انتہائی گرم تھی جہاں کیمیائی عمل ممکن ہی نہ تھا۔ کروڑوں سال بعد جب زمین کا درجہ حرارت مناسب حد تک گر گیا تو زمین کی بیرونی سطح پر موجود چار قسم کے نسبتاً ہلکے ایٹمز ہائیڈروجن آکسیجن نائیٹروجن اور کاربن کے باہمی ٹکراؤ سے مرکبات وجود میں آنے شروع ہو گئے۔ انہی بے جان (Inorganic) عناصر سے نامیاتی (Organic) سالمات یا مرکبات وجود میں آئے جیسا کہ جناب یحییٰ نے کاربن کے ذِکر میں لکھا ہے۔ ''کاربن دوری جدول (Periodical Table) میں چھٹا عنصر ہے یہی زمین پر زندگی کی اساس بھی ہے۔ کیونکہ تمام نامیاتی سالمے مثلاً (نیوکلیئک ایسڈز امانیو ایسڈز پروٹینز روغنیات اور شکریات وغیرہ) کاربن ہی کے دوسرے عناصر کے ساتھ مختلف انداز سے ملنے پر تشکیل پاتے ہیں۔ کاربن..... ہائیڈروجن آکسیجن اور نائٹروجن وغیرہ سے مل کر لاکھوں مرکبات بناتا ہے''۔ یہ پورا عمل ہی ارتقاء کا عمل ہے جس میں کروڑوں سال کا عرصہ لگتا ہے۔ یہ تمام عمل جادو کی چھڑی سے نہیں بلکہ خالق کائنات کے متعین کردہ قوانین کے عین مطابق ہو رہا ہے۔

زمین کی تخلیق میں سائنسی ثبوت کی بات صرف جناب یحییٰ نے ہی نہیں کی۔ بلکہ یہ تو ایسی حقیقت ہے جس کو ارتقاء کے قائلین زیادہ اجاگر کرتے ہیں کیونکہ ارتقاء کی ابتداء بہرحال حیات و کائنات کے انہی مادی و عنصری ربط و نظام سے ہوتی ہے۔ دیگر سائنسدانوں کے علاوہ اسٹیفن نے بھی زمین کی منفرد خصوصیات پر اپنی کتاب ''گرینڈ ڈیزائن'' میں ایک پورا باب شامل کیا ہے۔ وہ زمینی خصوصیات سے

اتنے متاثر ہیں کہ انہیں معجزہ سمجھتے ہیں بلکہ انہوں نے اس باب کو ایک واضح معجزہ (The Apparent Miracle) کا عنوان دیا ہے۔ اس باب میں انہوں نے زمین کی منفرد اور ذاتی خصوصیات کا تفصیل سے ذِکر کیا ہے جو اس موضوع پر خود کفیل ہے۔ پہلی اور بہت ہی اہم خصوصیت زمین کا سورج سے مناسب فاصلہ ہے۔ اگر یہ فاصلہ دو منٹ سے کم یا زیادہ ہوتا تو ہر دو صورتوں میں زندگی کی موجودگی ناممکن ہو جاتی۔ پھر اس کا مدار اگر سرکلر کی بجائے لمبائی میں زیادہ ہوتا تو بھی زندگی ناممکن ہو جاتی کیونکہ۔

"Circular orbits are friendly to life, While elongated orbits result in long reasonal temperature fluctuations"

اس کے علاوہ سورج کی کمیت، زمین کا قطبین پر جھکاؤ، اس کی گردشی رفتار، اس کی اپنی کمیت، زمینی کشش ثقل، اس کا اندرونی ڈیزائن، اس کا کرہ ہوائی، زمین کی اپنی جسامت، چاند سے اس کا موزوں فاصلہ، زمین میں کیمیائی چکر (Chemical Cycle)، اس کے پانی کو مائع حالت میں برقرار رکھنے کے لئے موزوں درجہ حرارت، اس کی فضا میں اوزان کی مناسب سطح اور اس کا موزوں مقناطیسی میدان، یہ تمام باتیں زندگی کے لئے اشد ضروری ہیں۔ علاوہ ازایں اسٹیفن کے مطابق اگر کمزور نیوکلیئر فورس کائنات کے آغاز کے وقت موجودہ قوت سے کم ہوتی تو کائنات میں موجود تمام ہائیڈروجن، ہیلیم میں تبدیل ہو جاتی جس کے نتیجے میں ستاروں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اور اگر پروٹانز 0.2 فیصد بھی بھاری ہوتے تو وہ نیوٹرانز میں ڈھیر (Decay) ہو جاتے جس سے ایٹمز غیر مستحکم ہو جاتے۔ اگر کوارک کی مجموعی کمیت دس فیصد بھی تبدیل ہو جاتی تو مستحکم ایٹمز نیوکلی (Nuclei) جن سے ہم بنے ہیں، بہت ہی کم مقدار میں موجود ہوتے۔ جناب یحییٰ بالکل درست فرماتے ہیں کہ ''یہ اور ایسی لاتعداد تفصیلات بار بار ایک ہی سادہ اور واضح حقیقت کی تصدیق کر رہی ہیں کہ صرف اور صرف اللہ نے کائنات، ستاروں، سیاروں، پہاڑوں اور سمندروں کو بہترین انداز میں تخلیق کیا ہے۔ اسی ذات پاک نے انسانوں اور دوسرے جانداروں کو زندگی بخشی اور اسی نے اپنی مخلوقات پر انسان کو خلیفہ مقرر کیا''۔ جناب یحییٰ صاحب نے یہاں فرمایا ہے کہ انسان کو اللہ نے باقی مخلوقات پر خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اپنا خلیفہ نہیں بنایا۔

ناقدینِ ارتقاء کا اصل اعتراض ارتقاء کے ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظریے پر ہے جس کے مطابق کہا جاتا ہے کہ کائنات کسی خالق کے بغیر خود بخود اتفاقاً وجود میں آ گئی ہے اور اب یہ یونہی بغیر کسی مقصد اور منزل کے سرگرمِ عمل ہے۔ اِن ناقدین کا کہنا ہے کہ ''یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کائنات کی ہر شے میں تخلیق کا جو عمل دیکھائی دیتا ہے وہ اس کائنات کے خود بخود وجود میں آ جانے سے ممکن نہ تھا''۔ بات ان کی درست ہے کہ ہر چیز تخلیق کی گئی ہے خود بخود وجود میں نہیں آئی۔ لیکن وہ اگر تھوڑا سا تخلیق کے اس عمل پر گہرائی میں جا کر غور کریں تو ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ تخلیق کے ساتھ ارتقاء بھی خود بخود یا یوں ہی اتفاقیہ طور پر نہیں ہو رہا بلکہ تخلیق کی طرح ارتقائی عمل بھی اللہ کے پروگرام اور قوانین کے مطابق جاری ہے اور اس کا بھی ایک مقصد اور منزل ہے۔ اب اگر کچھ لوگ کائنات، تخلیق یا ارتقاء کو

بے مقصد اور بغیر کسی خالق کے سمجھتے ہیں تو ان کے موقف کو درست سمجھ کر کائنات، تخلیق یا ارتقاء سے انکار کر دینا بھی درست بات نہیں۔ یا ان ناقدین کا یہ کہنا کہ ''جب جاندار خلیئے کی ساخت اور اس کی کارگذاری کے بارے میں زیادہ تفصیلات سامنے آئیں تو یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ جاندار خلیہ ایک سادہ، الل ٹپ طریقے سے متشکل ہونے والی شے نہیں''۔ بالکل درست بات ہے لیکن آپ اسے ارتقائی عمل کی تردید میں کیسے پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اتفاق اور الل ٹپ الگ تصورات ہیں اور خود ارتقائی عمل دوسری حقیقت ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے مخلوط نہیں کرنا چاہئے۔ اور جاندار خلیہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے بھی غیر نامی ارتقاء جاری تھا اور اس کے بعد بھی نامی (Organic) ارتقاء جاری ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین اپنی کتاب ''آئیڈیالوجی آف دی فیوچر'' میں کہتے ہیں۔

"The world did not come into existence suddenly as a finished product but it was created to acquire its present shape gradually by a process of evolution. Creation took the form of evolution because all creation, Whether human or divine, takes this form."

غیر نامی ارتقاء کی تشریح یوں کرتے ہیں۔

"Thus, in the course of ages, matter ws able to evolve in to higher and higher states through the creative activity of the driving force of the desire consciousness."

ان کا کہنا ہے کہ ارتقائی سلسلہ اس وقت تک جاری رہا تا آنکہ پہلا جاندار خلیہ منظر عام پر آ گیا پہلے خلیئے کی پیدائش کو وہ ایک اہم واقعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ

"The appearence of the amoeba was a momentous event in the history of life because now life embarked on an entirely new career wich constituted the second definitely marked stage of its evolution."

ایک ناقابلِ تردید حقیقت یہ بھی ہے کہ تخلیق یا ارتقاء کے بارے میں سب سائنسدانوں کا نظریہ مادہ پرستانہ نظریات پر مشتمل نہیں بلکہ وہ اسے اللہ کی صفتِ خالقیت سے منسلک کرتے ہیں۔ ان میں کوپرنیکس، کیپلر، گلیلیو، نیوٹن، آئن سٹائن، نیل بوہر، میکس پلانک، سر آرتھر ایڈنگٹن، سر جیمز جین، فریڈ ہائل، پال ڈیویز جیسے درجنوں بڑے بڑے سائنسدان شامل ہیں۔

نیوٹن کے بارے میں اسٹیفن کا کہنا ہے۔

"Newton believed that our strangely habitable solar system did not "arise out of chaose by the mere laws of nature" instead, he mentioned, The order in the universe was "created by, God at first and conserved by Him to this day in the same state and condition."

اسی طرح وہ فریڈ ہائل کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"Hoyal wrote, "I do not believe that any scientist who examined the evidence would fail to draw the inference that the laws of nuclear's physics have been deliberately desingned with regard to the consequences they produces inside the stars."

اسٹیفن نے ان سائنسدانوں کے خیالات کو دیانتداری سے نقل تو کر دیا ہے۔لیکن وہ خود کسی ہستی کو خالقِ کائنات نہیں سمجھتے اس لئے کہتے ہیں کہ اس وقت چونکہ نیوکلیئر فزکس اور دیگر کائناتی قوانین کے متعلق کم معلومات میسر تھیں اس لئے انہوں نے ایسا کہہ دیا تھا۔

جناب یحییٰ کا یہ کہنا درست ہے کہ ''ایک خلیئے کی تشکیل کا اتفاقی امکان ناممکن ہے''۔لیکن ان کا یہ کہنا کسی پہلو سے بھی بجا نہیں ہو سکتا کہ ''نظریۂ ارتقاء دعویٰ کرتا ہے کہ یہ نظام (خلیہ) جسے انسان اپنی تمام تر ذہانت، علم اور حاصل کردہ ٹیکنالوجی کے باوجود بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا اِتفاقاً وجود میں آ گیا''۔نظریۂ ارتقاء اس طرح کے دعوے نہیں کیا کرتا۔ وہ تو اللہ کی صفتِ ربوبیت کا عملی اظہار ہے۔ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اپنی کتاب ''قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل'' میں کائناتی مقصد کے قوانین 45:22 پر بحث کے دوران ارتقاء کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔''یہ کائناتی قانون، قرآن مجید کی زبان میں توربوبیت کا قانون ہے اور سائنس کی زبان میں ارتقاء یا نشوونما کا قانون ہے۔ربوبیت کے قانون سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رب ہے، یعنی ایسی ذات جو بتدریج ہر مخلوق کی تربیت اس کی مناسبت سے کرتی رہے اور کمال پر پہنچا دے''۔اوپر کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات فریڈ ہائل کا ایک اقتباس اتفاقات کی نفی میں دیا گیا ہے۔ابتدا میں وہ بھی کسی ہستی کو کائنات کا خالق تسلیم نہیں کرتے تھے۔جناب (ہارون) یحییٰ نے انہیں ارتقاء پسند کہا ہے جو درست نہیں وہ تو کائنات کو بنی بنائی، ازلی اور ابدی سمجھتے تھے۔اسی لئے انہوں نے بگ بینگ نظریے کے مقابلے میں 'Steady State' نظریے کو وضع کیا تھا جو کائنات کو بنی بنائی شے قرار دیتا تھا جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ان کا یہ نظریہ بگ بینگ کے سامنے نہ چل سکا اور جلد ہی مات کھا گیا۔تاہم بعد میں انہوں نے خدا کو کائنات کا خالق تسلیم کر لیا تھا۔ان کا یقین تھا کہ انسان سمیت ہر

چیز کو خدا نے تخلیق کیا ہے اور کوئی چیز اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آتی۔ مثلاً ہل برائین اپنی کتاب 'تاریخِ موجودات' میں امینوایسڈ کی پیچیدگی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''بے ترتیب حالات اور طوائف الملوکی کی کیفیت میں ایک امینوایسڈ کا بننا بھی محال ہے''۔ یہاں انہوں نے فریڈ ہائل کا ایک مختصر اقتباس دیا ہے۔ فریڈ ہائل کے مطابق ''یہ ایسے ہی ہوگا کہ ہوائی جہازوں کے پرزوں کے گودام میں آندھی چلے اور جب اس کا زور ٹوٹے تو وہاں تیار شدہ جہاز کھڑے ہوں''۔ ہل برائین کے نزدیک یہ ایک خوبصورت تشبیہ ہے۔ جناب (ہارون) یحییٰ نے بھی یہی اقتباس دیا ہے۔ جناب فتح اللہ اور جناب فاروق یحییٰ دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ سارے سائنسدان مادہ پرستی کے شکار نہیں۔ اس لئے انہیں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ ارتقائی عمل اور مادہ پرستانہ فلسفے کا باہم کسی قسم کا تعلق واسطہ نہیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اشیائے کائنات کے اتفاقیہ طور پر وجود میں آنے کی تردید صرف ناقدینِ نظریہ اِرتقاء ہی نہیں کرتے بلکہ اکثر بڑے اہم اور مشہور سائنسدانوں نے بھی اس تصور کو مسترد کیا ہے جن کے چند نام اوپر دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ نظریہ بگ بینگ اور کائنات کے ماخذ پر سب سے پہلے تحقیق کرنے والے پولینڈ کے جیورجیز لامیترے خود پادری تھے۔ اسی طرح سورج مرکز نظام شمسی کے بانی کوپرنیکس لاٹ پادری کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر لائیڈ مارگن' پروفیسر اے۔ وی۔ ہل۔ عظیم فلسفی پسکال' پروفیسر کوبن' تھامس کارلائل' ڈاکٹر میسن' پروفیسر راشڈل ہٹنگز' عظیم نفسیات داں ڈاکٹر ژنگ اور ڈاکٹر پکتھال جیسے درجنوں دیگر فلسفی و دانشور ہیں جو اتفاقات کے قائل نہیں لیکن ارتقاء کے قائل ہیں۔ اس لئے میری ایک دفعہ پھر استدعا ہے کہ تدریجی ارتقاء کو ملحدانہ اور مادہ پرستی کے تصورات سے نہ جوڑا جائے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا عملی طریقہ سمجھا جائے۔ جبھی ہم ملحدانہ نظریات کا دلائل کے ساتھ توڑ کر سکتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر رفیع الدین نے مشورہ دیا ہے۔ انہی لوگوں میں عظیم سائنسدان آئن سٹائن بھی شامل ہیں انہوں نے بھی کائناتی امور میں اتفاقات کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ان کے بارے میں میرے گذشتہ مضامین میں ذِکر ہوتا رہا ہے۔ اسٹیفن کے مطابق انہوں نے کوانٹم کے تصور پر اہم کام کیا لیکن ''آئن سٹائن بنیادی قوانین میں اٹکل پچو نا قابلِ پیشین گوئی عنصر سے خوف زدہ تھا۔ اس نے کوانٹم مکینکس کو کبھی بھی پوری طرح قبول نہیں کیا۔ اس کے احساسات کا اظہار مشہور جملے میں ہوا ''خدا پانسہ نہیں کھیلتا''۔ دراصل ان کا پختہ یقین تھا کہ کائنات کا نظام اتفاقات پر نہیں بلکہ شعوری طور پر مرتب کردہ قوانین کے مطابق چل رہا ہے اسی لئے انہوں نے نیل بوہر سے پوچھا تھا کہ "Do you believe that God plays dice with the universe?" یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ سوال اکثر پوچھا کرتے تھے اسی لئے نیل بوہر نے زچ ہو کر جواب دیا۔ "Do not tell God what to play." یہ سوال پوچھنے سے ان کا مقصد تھا کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا نظام 'Well defined Laws' سے چلا رہا ہے نہ کہ جُوے سے۔ لیکن اسٹیفن نے آئن سٹائن کے اس موقف کو قبول نہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسی بات نہیں کیونکہ

"God does not only play dice but also sometimes throws them where they cannot be seen"

آئن سٹائن نے ایک دفعہ کائنات کے بارے میں کہا تھا کہ

"The incomprensible thing about the universe is that it is comprehensible."

تو اسٹیفن نے اس کی وضاحت اس طرح کی تھی۔

"The universe is comprehensible because it is governed by scientific laws, That is to say, its behaviour can be modelled."

لیکن یہاں اپنے مؤقف کے برعکس کہتے ہیں کہ کائناتی نظام جوئے خانہ کی طرح چل رہا ہے۔ یہ تو خیر دو سائنسدانوں کا مسئلہ تھا۔ حیرانی تو جناب فتح اللہ کے تبصرے پر ہوتی ہے انہوں نے بھی آئن سٹائن اور نیل بوہر کے مابین ہونے والے مکالمات کا ذِکر کیا ہے لیکن اسٹیفن کا جواب لکھنے کے بعد ان سے متفق ہو کر کہتے ہیں۔

"Here hawking refers to the unseen of the universe."

غالباً فتح اللہ کا اشارہ بلیک ہولز کی طرف ہے۔ کائنات کا کوئی مظہر انسان کے لئے مرئی ہو یا غیر مرئی اللہ تعالیٰ کے قوانین ہی ہر جگہ لاگو ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں جناب فتح اللہ نے اسٹیفن کے غلط مؤقف کی حمائت کیوں کی اور 'Seen' یا 'Unseen' میں تفریق کیسے کی' اللہ تعالیٰ سے تو کوئی شے غائب نہیں۔

ان ناقدینِ اِرتقاء نے انسانی جسم میں کارفرما کیمیائی عناصر یا مرکبات مثلاً خلیات' ڈی۔این۔اے' آر۔این۔اے۔ جینز' پروٹینز وغیرہ کو نظریۂ ارتقاء کی تردید میں پیش کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یہ کیمیائی عوامل اتفاقیہ طور پر نہیں بن سکتے۔ یہ دلیل تو درست ہے کہ یہ مرکبات خود بخود نہیں بن سکتے لیکن ارتقائی عمل سے اس دلیل کا قطعاً کوئی تعلق واسطہ ہے ہی نہیں اسی لئے ارتقا پسند حکماء کا بھی ایسا ہی خیال ہے کہ یہ اشیا خود بخود وجود میں نہیں آ سکتیں۔ مثلاً خلیوں کے بارے میں اوپر بات ہو چکی ہے۔ بل برائین نے ان کیمیائی مرکبات کی پیچیدگیوں کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور اسی نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ تمام اشیاء اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آ سکتی۔ وہ بات کو پروٹینز سے شروع کرتے ہیں کہ ''شاید ایک کروڑ پروٹین میں سے ہر ایک مکمل طور پر منفرد ہے۔ اور ہر ایک کا آپ کو خوش و خرم زندگی عطا کرنے میں اہم رول ہے۔ اور یہیں سے سلسلہ چلتا ہے۔ پروٹین کی افادیت اسی صورت میں ممکن ہے جب امینو ایسڈز کی اجزائے ترکیبی صحیح ہو۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اسے ایک مخصوص شکل و شباہت کا ہونا چاہئے۔ ساخت کی اس پیچیدگی کے اصول کے بعد بھی پروٹین بیکار ہے اگر اس میں خود مختار پیداواری صلاحیت نہیں۔ لیکن پروٹینز اس خواص سے محروم ہیں! جب تک D.N.A نہ ہو۔ اس کو اس میں

یدِطولیٰ ہے اور یہ سیکنڈوں سے بھی کم عرصے میں اپنی فوٹو کاپی بنا سکتا ہے علاوہ ازیں اسے کوئی کام نہیں آتا اس طرح تضاد کی ایک انتہائی کیفیت پیدا ہوگئی۔ پروٹینز D.N.A کے بغیر کچھ نہیں اور D.N.A پروٹینز کی غیر موجودگی میں بے کار ہے تو اس سے کیا ہم یہ مفروضہ قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دونوں ایک ہی وقت میں پیدا ہوئے اگر ایسا ہوا تو!''

وہ مزید کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوتا'' کچھ اور بھی چاہئے۔ DNA' پروٹینز اور دوسرے اجزا افزائش کے متحمل نہیں ہو سکتے جب تک ایک جھلی میں ان سب کو یکجا نہ کیا جائے۔ کسی جوہر یا سالمے نے اپنے طور پر زندگی کا حصول نہیں کیا (قابل توجہ عزیز) آپ ایک ایٹم یا سالمے کو اپنے جسم سے الگ کر کے دیکھ لیں اس کی حیثیت ریت کے ذرّے جتنی ہوگی۔ اس کے پنپنے اور بقا کا راز اسی میں ہے کہ وہ ایک خلیے کی مہربان آغوش میں محصور ہوں اور اسی وقت ہی یہ مختلف اجزائے ضروری' زندگی کے اس حیران کن رقص میں شمولیت کے مجاز ہوتے ہیں۔ خلیے کے بغیر ان کی اہمیت نہیں وہ محض دلچسپ کیمیائی اجزا بن جاتے ہیں۔ لیکن کیمیائی اجزا کی غیر موجودگی میں خلیہ بھی بے وقعت ہے''۔ پال ڈیویز ارتقاء کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اگر ہر چیز کو دوسری چیز کی ضرورت نہیں تو پھر خلیوں کا خانوادہ کیسے ظہور پذیر ہوا''۔ اسی لئے وہ اسے زندگی کا معجزہ کہتے ہیں۔ جناب یحییٰ نے بتدریج ارتقاء جیسی حقیقت کو فریب قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ D.N.A اتفاقیہ طور پر خود بخود وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس دلیل کا تعلق بھی ارتقاء کے تصور سے نہیں ہے کیونکہ ارتقاء کا آغاز کسی چیز کی تخلیق کے بعد ہوتا ہے۔ اس موضوع پر پہلے بھی بات ہو چکی ہے۔ اور یہ موقف جناب یحییٰ یا دیگر معاندینِ ارتقاء ہی کا نہیں' دیگر کئی سائنسدانوں اور دانشوروں کا بھی یہی کہنا ہے کہ DNA ہی نہیں بلکہ کوئی بھی کیمیائی جز اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آ سکتا۔ جیسا کہ بل برائین کے مندرجہ بالا اقتباس سے عیاں ہے۔ وہ پروٹینز کی پیچیدگیوں پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''پروٹینز اس وقت بنتے ہیں جب ہم امینو ایسڈز کو ایک رسی کی صورت میں پروتے ہیں لیکن ہمیں بہت سے امینو ایسڈز درکار ہیں۔۔۔۔ انسانی جسم میں ایک ملین سے زیادہ پروٹینز موجود ہوتے ہیں جن میں ہر ایک اپنی حیثیت میں ایک معجزہ ہے''۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ۔ ''گولے جن' جو ایک عام پروٹین ہے' کے بنانے میں 1055 امینو ایسڈز کو ایک خاص طریقے سے ترتیب دینا ہوتا ہے۔ لیکن سب سے اہم امر یہ ہے کہ آپ اس کو بنا نہیں سکتے۔ یہ خود بنتا ہے اچانک اور بغیر کسی ہدایات کے اور اسی جگہ ناممکن کا ظہور ہوتا ہے۔ یہاں بل برائین غیر محسوس انداز میں تسلیم کر رہے ہیں کہ ان اجزا کو کوئی نادیدہ ہستی ہدایات دیتی ہے۔ جبھی وہ بنتے ہیں ورنہ انسان کے لئے تو یہ ناممکن ہے۔ خود ان کا کہنا ہے کہ ''1055 عناصر کا خاص ترتیب اختیار کرنا ناممکن العمل ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا اس کا وجود ایک کرشمہ ہے''۔

یہاں DNA کے متعلق میں اسٹیفن کی مثال دوں گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کائنات اور زندگی کا ظہور ایٹمز کے تعامل سے اتفاقیہ طور پر ہوا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"I take it that some very premitive form of life arose spontaneously on earth from chance combinations of atoms."

لیکن DNA کے بارے میں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اتفاقیہ طور پر نہیں بن سکتا۔ ان کے الفاظ

"This early form of life was probably a large molecule. But it was probably not DNA, since the chances of forming a whole DNA molecule by random combinations are small."

جناب یحییٰ ارتقاء کے خلاف ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ مختلف عناصر کو آپس میں ملانے سے زندگی کا ظہور نہیں ہوتا۔ بات یہ بھی درست ہے لیکن اس دلیل سے ارتقاء کی نفی نہیں ہوتی۔ زندگی کے Origin کے بارے میں آگے چل کر بات ہوگی۔ یہاں صرف اتنی عرض کروں گا کہ اس حقیت کا اظہار صرف ناقدین ہی نہیں کرتے بلکہ ارتقاء کے قائلین بھی یہی کہتے ہیں۔ بل برائسن کا کہنا ہے کہ ''آپ ان تمام اجزا پر نظر ڈالیں جو انسانی جسم میں شامل ہیں۔ کاربن ہائیڈروجن' آکسیجن وغیرہ اور انہیں ایک برتن میں ڈال کر اس میں تھوڑا پانی ڈال دیں اور پھر زور سے اسے ہلائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک صحیح سلامت انسان اس برتن میں نکل آئے' یہ انتہائی حیران کن ہوگا''۔ ان لوگوں کی تردید میں' جو کہتے ہیں کہ پروٹینز آناً فاناً ظہور میں آئے' ڈاکٹر ڈاکنز کہتے ہیں۔ ''پروٹینز ایک دم نہیں بنتے۔ لازمی طور پر کوئی ایسی اجتماعی انتخابی تحریک موجود ہوگی جس کے زیر اثر امینوایسڈز نے ایک خاص ترتیب اختیار کی''۔

اس سلسلے میں بل برائین نے ایک واقعہ کا حوالہ بھی دیا ہے' جس کے مطابق 1953ء میں شکاگو یونیورسٹی کے ایک گریجوایٹ طالب علم اسٹینلے ملر نے چند ضروری کیمیائی اجزا مثلاً میتھین' امونیا اور ہائیڈروجن سلفائیڈ گیسز کے آمیزہ پر تجربہ کر کے زندہ خلیہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ جس کے نتیجے میں کچھ دنوں بعد پانی ایک سبز رنگ کے مواد میں تبدیل ہو گیا جس میں امینوایسڈز فیٹی (Fatty) ایسڈز' شوگرز اور دوسرے نباتاتی مرکب شامل تھے۔ بل برائین کہتے ہیں کہ ''اخبار والوں نے اس خبر کو بہت اچھالا۔ اور ایسا تاثر دیا کہ مندرجہ بالا مرکب تیار کریں' اسے ذرا ہلائیں تو جاندار رینگ کر سامنے آ جائیں گے۔ وقت گذرنے کے ساتھ اندازہ ہو گیا کہ معاملہ اتنا سادہ نہ تھا۔ 50 سالوں تک اس مسئلہ پر کام کرنے کے باوجود ہم اس حقیقت کے انکشاف سے اتنے ہی دور ہیں جتنے 1953ء میں تھے''۔ جناب یحییٰ نے ارتقائی عمل کے خلاف ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ ملر کا تجویز کردہ کرہ فضائی حقیقت میں ویسا نہیں تھا جو اس نے فرض کیا تھا۔ یہ دلیل بھی ان کی کئی دلیلوں کی طرح زیر بحث موضوع سے قطعی طور پر غیر متعلقہ ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''نظریۂ ارتقاء کے آخری ماخذوں نے ملر کے تجربہ کو متنازعہ بنا دیا ہے۔'' حالانکہ بل برائین ایسے تجربات کو صرف متنازعہ نہیں سمجھتے بلکہ ابھی تک انہیں ناممکن سمجھتے ہیں۔ ملر کے کرہ باد کی ابتدائی ترکیب کو بھی بل برائین نے مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابتدائی حالت بہت ہی سُست نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے محلول پر مشتمل تھی۔

(جاری ہے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

الملا الاعلیٰ

قرآن کریم میں الملاء الاعلیٰ کے یہ الفاظ دو مقامات پر آئے ہیں۔

(1) اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِزِیۡنَۃِ ۨ الۡکَوَاکِبِ ۝ وَحِفۡظًا مِّنۡ کُلِّ شَیۡطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا یَسَّمَّعُوۡنَ اِلَی الۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰی وَیُقۡذَفُوۡنَ مِنۡ کُلِّ جَانِبٍ [37:6-8]۔ (ترجمہ) ہم نے رونق دی ورلے آسمان کو ایک رونق جو تارے ہیں اور بچاؤ بنایا ہر شیطان سرکش سے، سن نہیں سکتے اوپر کی مجلس کی اور پھینکے جاتے ہیں ان پر ہر طرف سے۔

(2) قُلۡ ہُوَ نَبَؤٌا عَظِیۡمٌ ۝ اَنۡتُمۡ عَنۡہُ مُعۡرِضُوۡنَ ۝ مَا کَانَ لِیَ مِنۡ عِلۡمٍۭ بِالۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰۤی اِذۡ یَخۡتَصِمُوۡنَ ۝ اِنۡ یُّوۡحٰۤی اِلَیَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ [38:67-70] ۔ (ترجمہ) تو کہہ یہ بڑی خبر ہے۔ تم اس کو دھیان میں نہیں لاتے۔ مجھ کو کچھ خبر نہ تھی اوپر کی مجلس کی، جب وہ آپس میں تکرار کرتے تھے مجھ کو تو یہی حکم ہوا ہے کہ اور کچھ نہیں میں تو ڈر سنا دینے والا ہوں۔

حواشی عثمانی میں ہے ''ملاءِ اعلیٰ (اوپر کی مجلس) ملائکہ مقربین وغیرہ کی مجلس ہے جن کے توسط سے تدابیر الٰہیہ اور تصریفاتِ کونیہ ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ یعنی ملاءِ اعلیٰ میں نظام عالم کے فنا و بقا کے متعلق جو تدبیریں یا بخششیں اور قیل و قال ہوتی ہے۔ مجھے اس کی کیا خبر تھی جو تم سے بیان کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے جن اجزاء پر مطلع فرما دیا وہ بیان کر دیئے۔ جو کچھ کہتا ہوں اُسی کی وحی و اعلام سے کہتا ہوں مجھے یہی کلمہ ملا ہے کہ سب کو آنیوالے خوفناک مستقبل سے خوب کھول کھول کر آگاہ کر دوں۔ رہا یہ کہ وہ وقت کب آئے گا اور قیامت کب قائم ہو گی۔ نہ اِنذار کے لئے اس کی ضرورت ہے نہ اس کی اطلاع کسی کو دی گئی۔ 38:70 کا حاشیہ۔

اوپر درج شدہ آیت 37:9 کے حاشیہ پر درج ہے ''اوپر کی مجلس سے مراد فرشتوں کی مجلس ہے۔ یعنی شیاطین کو یہ قدرت نہیں دی گئی کہ فرشتوں کی مجلس میں پہنچ کر کوئی بات وحی الٰہی کی سن آئیں۔ جب ایسا ارادہ کر کے اوپر آسمانوں کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو جس طرف سے جاتے ہیں اُدھر سے ہی فرشتے دھکے دے کر اور مار مار کر بھگا دیتے ہیں۔

جلالین میں مرقوم ہے ''الملاء الاعلیٰ چونکہ فرشتے آسمانوں میں ہیں، اس لئے ملاءِ اعلیٰ کہا گیا ہے۔ اور انس و جن زمینی ہیں ان کو ملاءِ اسفل کہا جائے گا۔ جلد 5، صفحہ 250

عام تصور یہی ہے الملا الاعلیٰ آسمانوں میں کوئی مقام ہے اللہ تعالیٰ کے درباری مشیر و وزیر ہیں جو آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ 38:64۔

اِس بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے سماء کا لفظ آسمان کے لئے استعمال ہی نہیں کیا۔ سما کے معنے بلندی کے ہوتے۔ امام راغب نے سماء کے معنے ہر شے کا بالائی حصہ لکھا ہے اور اِس کی تائید میں ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔ شاعر نے ایک گھوڑے کی تعریف میں کہا ہے

احمر کالدیباج اَمّا سماء
فِرّ یا و اَمّا اَرْضُہٗ فمحول

وہ دیباج کی طرح سرخ ہے۔ اِس کا بالائی حصہ موٹا اور گداز ہے اور اس کا زیرین حصہ لاغر و سخت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اسما نسبہ سے ہے کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سماء ہے۔ لیکن اسے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ واضح ہو کہ اسماء نسبہ وہ اسماء ہوتے ہیں جن کا جوڑ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم والد کہتے ہیں' تو اس کے مقابلہ میں اس کا جوڑ وَلَدٌ لازمی ملے گا۔ جب ہم شوہر کہتے ہیں تو اس کا مقابل جوڑ بیوی کا ہونا لازمی ہے۔ نیز یہ اعداد کی نسبت کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جائے کہ چار کو آٹھ سے وہی نسبت ہے جو پانچ کو دس کے ساتھ ہے۔ اسمائے نسبہ ہونے کی وجہ سے سماء کے مقابلہ میں ارض کا ہونا لازمی ہے۔ قرآن کریم میں ارض وسما بیشمار مقامات پر آتے ہیں' چونکہ ہر بلندی کو پستی کی نسبت سے سماء اور ہر پستی کو اس کی بلندی کی نسبت سے ارض کہتے ہیں' اس لئے ارض وسماء کے معنے کائنات کی بلندیاں اور پستیاں ہوں گے۔

''مصباح اللغاۃ'' نے ملاء کے معنی اشرافِ قوم جن سے دلوں میں ہیبت طاری ہو جائے' لکھا ہے۔ امام راغب نے بھی اس کے معنے سردار کے رقم کئے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِہٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ [7:60] اس کی قوم کے سردار بولے ہم تجھ کو صریح بہکا ہوا دیکھتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ ھٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ [7:109] فرعون کی قوم کے سردار بولے یہ تو کوئی واقف جادوگر ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے مَلَاء کے معنے سردار ہے۔ تو اس طرح المِلاء الاعلیٰ کے معنے بڑے سردار ہوگا لین Lane نے اپنی Lexicon میں اس کے معنے The most exalted princes اور Chief لکھا ہے۔ لہٰذا المِلاء الاعلیٰ کے معنے بلند مقام درست نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہند نے المِلا الاعلیٰ کا ترجمہ ''اوپر کی مجلس'' کیا ہے۔ جو لغوی اعتبار سے کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے فتح الرحمٰن میں مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ نیست مرا ہیچ دانش بحال ایں جماعتِ بلند قدر از فرشتگاں۔ انہوں نے ملاءِ اعلیٰ کا ترجمہ ''ایں جماعتِ بلند قدر'' کیا ہے۔ یہ تراجم لغوی نہیں ہیں بلکہ احادیث کے زیر اثر کئے گئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے یہ الفاظ قرآن کریم میں صرف دو مقامات پر آئے ہین۔ ایک تو یہی مقام ہے جس آیت کا ترجمہ لکھا گیا ہے جو شاہ ولی اللہ صاحب نے کیا ہے۔ یہ پوری آیت اِس طرح ہے۔ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ ○ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ○ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ کہہ دو کہ وہ ایک عظیم خبر ہے۔ تم اِس سے اعراض کئے ہوئے ہو۔ مجھے عالمِ بالا کی باتوں کی کچھ خبر نہ تھی جب کہ وہ جھگڑ رہے تھے۔ یہ ترجمہ ''تدبر قرآن'' میں کیا گیا ہے۔ یہاں ملاءِ اعلیٰ کا ترجمہ عالم بالا کیا گیا ہے۔ اس کی تفسیر کے ذیل میں مرقوم ہے۔ ''یعنی ان کو آگاہ کردو کہ جس چیز سے میں تمہیں ڈرا رہا ہوں وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ بڑا ہی اہم حادثہ ہے۔ لیکن تم اس سے بے پروا ہو اور میرے اِنذار کا مذاق اُڑا رہے ہو یعنی اِس غلط فہمی میں نہ رہو کہ میں یوں ہی تم پر دھونس جمانے کے لئے نذیر مبین بن بیٹھا ہوں۔ اور تمہیں مرعوب کرنے کے لئے اہل دوزخ کی باہمی تو تکار کا افسانہ سنا رہا ہوں۔ بھلا عالم بالا کی ان باتوں کی مجھے کیا خبر ہو سکتی تھی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعے سے مجھے اس لئے آگاہ فرما رہا ہے کہ میں ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے کی طرح اس پیش آنے والے دن کی ہولناکی سے آگاہ کردوں ورنہ میں کوئی غیب دان نہیں ہوں۔ میں تو بس ایک نذیر مبین ہوں''۔

تفسیر معارف القرآن میں اس آیت کے ذیل میں تحریر ہے ''مجھ کو عالمِ بالا کی کچھ خبر نہیں تھی بلکہ وہ گفتگو کر رہے تھے۔ یعنی یہ میری رسالت کی واضح دلیل ہے کہ میں تم سے عالم بالا (ملاءِ اعلیٰ کی ایسی باتیں بیان کرتا ہوں جو وحی کے سوا کسی بھی ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتیں''۔

اب اِس آیہ کریمہ کی ہماری طرف سے پیش کردہ تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

جب سے انسانیت میں سوچ سمجھ کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اس کو اپنی سوچ کے علاوہ وحی الٰہی کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ وہ اپنے مسائل خود حل کرنے سے قاصر تھی' قرآن کریم انسانی سوچ اور وحی الٰہی کی روشنی سے استفادہ کرنے کی داستان حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے بیان کرتا چلا آ رہا ہے۔ پورے قرآن میں انبیائے کرام اور اقوام سابقہ کی اس کشمکش کا تذکرہ چلا آ رہا ہے۔ پہلے پہلے رسولوں کا مخاطب طبقہ محدود ہوتا تھا' اس طبقہ اور علاقہ میں وسعت ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساری انسانیت کے لئے قرار دی گئی حضورؐ کے اپنے عہد میں بھی وہ حق باطل کا تصادم جاری رہا۔ حضور اقامتِ دین کی کوشش کر رہے تھے اور مشرکین کا مخالف گروپ اس اقامت دین کو حد درجہ روک رہا تھا اور اس میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر رہا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ حق کی فتح ہونی شروع ہوئی۔ مشرکین کو بھی احساس ہونا شروع ہوا کہ وہ پسپا ہو رہے ہیں چنانچہ قرآن میں حضور سے خطاب ہوا عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ۔ اے رسول تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے یہ مخالف کس چیز کے بارے میں آپس میں باتیں کر رہے ہیں فرمایا عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ○ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ [78:3] اب یہ اس اقامت دین کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جس کے متعلق ان میں خود

ہی اختلاف ہو گیا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ انقلاب آنے والا ہے' کچھ کا خیال ہے کہ انقلاب نہیں آ سکتا **كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ**' لیکن ان کے اس تذبذب کا عرصہ زیادہ نہیں رہا' انہیں جلد معلوم ہو جائے گا **ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ** [78:5] پھر یقین سے سن لیں کہ اُنہیں معلوم ہو جائے گا۔ جس لفظ کو حضورؐ کی اقامتِ دین کی کشمکش اور اس کے نتیجہ کو عن النبأ العظیم کہا گیا ہے' وہ ہی نبوأ عظیم کے الفاظ زیرِ غور آیت میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوا **قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ○ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ** [38:67-68] فرمایا کہ ایک بہت بڑا واقعہ ہونے والا ہے۔ لیکن تم اس سے روگردانی کر رہے ہو' اور یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری روگردانی کی وجہ سے وہ واقعہ نہیں ہوگا۔ فرمایا کہ سابقہ انبیائے کرام نے بھی اقامت دین کا یہی پیغام دیا تھا اور ہر نبی کی قوم کے سرداروں نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس نبی سے جھگڑا کیا تھا۔ جس طریقہ سے تم میری مخالفت کر رہے ہو۔ مجھے ان کے جھگڑے کا کوئی علم نہیں کہ ان کا جھگڑا اپنے رسول سے کس نوعیت کا ہوتا تھا لیکن اتنی بات وثوق سے کہتا ہوں **مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ** [38:69] مجھے اس بات کا علم نہیں کہ انبیائے کرام سے ان کی اقوام کے سرداروں نے کس طرح جھگڑا کیا **اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ** [38:70] ہاں البتہ وحی کے ذریعے مجھے جو کچھ ان کے متعلق بتایا گیا ہے وہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ جس طرح یہ زندگی گذار رہے ہیں' اس کا انجام بربادی اور ناکامی ہے۔

الملاِ الاعلیٰ کے الفاظ دوسری جگہ اِس آیت شریفہ میں آتے ہیں۔ **اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِالْكَوَاكِبِ ○ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ○ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ** [37:6-8] فضا کی یہ بلندی جو تمہیں قریب تر نظر آ رہی ہے اس میں مختلف کُرّے ہیں جو اپنی چمک کی وجہ سے تمہیں نہایت روشن دکھائی دیتے ہیں یہ ہر نجومی کی دسترس سے باہر ہیں۔ وہ نجومی اعلیٰ سرداروں کے مشوروں کو نہیں سن سکتے' اور وہ نجومی ہر طرف سے دھتکارے جاتے ہیں۔

مشرکین عرب کا خیال تھا کہ نجومی ستاروں سے پیشگوئی لیتے تھے اور عالم بالا کی خبریں لاتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا نہ تو ایسا کوئی دربار ہے اور نہ ہی اِس کے ہاں سرداروں کی آمد و رفت ہے۔ یہ تصور دینا کہ شیاطین عالم بالا میں پہنچ کر وہاں سے خبریں لاتے تھے۔

ہمارے ہاں جس قدر بھی تفاسیر ہیں' ان میں روایات کے زیرِ اثر الملاِ الاعلیٰ کو آسمانوں پر ہی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ان تمام تفاسیر کا بیان کردہ مفہوم درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ الملا الاعلیٰ کا ترجمہ بلند مقام کر کے' اس کو عالم بالا بیان کرنا درست نہیں ہے۔ الملا الاعلیٰ کا لفظی ترجمہ بڑا سردار' یا افسر اعلیٰ ہے۔ اس کے معنے کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ہاں تمام تفاسیر روایات کے زیرِ اثر تحریر کی گئی ہیں۔ اور کسی جگہ بھی کوئی قرآنی روشنی راہنمائی کے لئے نہیں ملتی۔ ہمیں اس بات پر تو شدید اصرار ہے کہ سابقہ تفاسیر کا بیان کردہ مفہوم بالکل غلط اور خلاف قرآن ہے۔ لیکن ہمیں اِس بات پر اصرار نہیں کہ آیت نمبر 37:8 کا مفہوم حتمی طور پر درست ہے۔ یہ ہماری دیانت دارانہ سوچ ہے' اس میں ضروری نہیں کہ آپ اس سے اتفاق فرمائیں' قارئین کرام کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ اس آیت پر خود غور فرمائیں' اور اس کی اس طرح تفسیر کریں کہ اس میں الملاِ الاعلیٰ کا کوئی

چیستانی مفہوم سامنے نہ آئے۔ بلکہ اس کا وہ مفہوم سامنے آئے جس کا تعلق اِس دنیا سے ہو۔ اور اس میں اِس کے لفظی ترجمہ کو ضرور ملحوظ رکھا جائے۔ اس طرح باہم غور و فکر کرنے کے بعد نئی راہیں کھلتی چلی جائیں گی وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا..... [29:69] اور جنہوں نے ہمارے واسطے محنت کی، ہم ان کو اپنی راہیں سمجھا دیں گے۔

☆.....☆.....☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	400/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

مطبوعات طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس سے متعلق
ذاتی مشیر، منفرد مفکرِ قرآن و بانی تحریک طلوعِ اسلام اور تحریکِ پاکستان گولڈ میڈلسٹ

علامہ غلام احمد پرویز کی تصنیفات 2013

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد	نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)	*	1500	مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں	150	300
(تین جلدوں میں ـــــ فی جلد)	*	500	انسان نے کیا سوچا؟	300	600
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)	*	1600	اِسلام کیا ہے؟	200	400
(چار جلدوں میں ـــــ فی جلد)	*	400	کتاب التقدیر	300	600
تبویب القرآن (مجلّد)	*	*	جہانِ فردا (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)	200	400
تبویب القرآن (تین جلد میں)	*	*	شاہکارِ رسالت (سیرتِ فاروقِ اعظمؓ)	350	*
مطالب الفرقان (مکمل سیٹ ـــــ سورہ فاتحہ تا سورہ الحجر)	1900	3800	نظامِ ربوبیت (قرآن کا معاشی نظام)	300	600
مطالب الفرقان (جلد اول)	250	500	تصوف کی حقیقت	300	600
مطالب الفرقان (جلد دوم)	250	500	قرآنی قوانین	150	300
مطالب الفرقان (جلد سوم)	300	600	سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	*	400
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	300	600	سلیم کے نام خطوط (جلد دوم)	200	400
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	*	300	سلیم کے نام خطوط (جلد سوم)	250	500
مطالب الفرقان (جلد ششم)	300	600	طاہرہ کے نام خطوط	200	400
مطالب الفرقان (جلد ہفتم)	200	400	ختمِ نبوت اور تحریکِ ''احمدیت''	150	300
من و یزداں (اللہ کا صحیح تصور)	*	500	حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (قائدِ اعظمؒ)	*	100
اِبلیس و آدم	250	500	اقبالؒ اور قرآن (اول۔دوم)	300	600
جُوئے نور	250	500	مجلس اقبالؒ۔اول (شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی)	300	600
برقِ طور (داستانِ حضرت موسیٰؑ)	250	500	مجلس اقبالؒ۔دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد...)	*	200
شعلۂ مستور (حضرت عیسیٰؑ کی داستان)	250	500	قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان (مجموعۂ مقالات و خطبات)	200	400
معراجِ انسانیت (سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ)	300	600	بہارِ نو (مجموعۂ مقالات و خطبات)	200	400

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
ISLAM: A Challenge to Religion	300	600
Exposition of the Holy Quran	*	2000
The Book Of Destiny	300	600
Reasons for Decline of Muslims	*	300
Islamic Way of Living	100	200
Letters to Tahira	*	500
Quranic Laws	*	400
The Quranic System of Sustenance	*	600
Did Quaid-e-Azam Want to Make Pakistan a Secular State?	*	100
اسلامی معاشرت (روزمرہ کے متعلق قرآنی احکام وہدایات)	100	200
اسبابِ زوالِ امت	100	200
جہاد (جہاد کے متعلق قرآنِ کریم کے احکامات)	*	150
خدا اور سرمایہ دار (مجموعہ مقالات وخطبات)	*	400
سلسبیل (مجموعہ مقالات وخطبات)	200	400
فردوسِ گم گشتہ (مجموعہ مقالات وخطبات)	200	400

متفرق کتب

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مقامِ حدیث	200	400
قرآنی فیصلے (جلد اول)	300	600
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	300	600
قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	*	150
مزاج شناسِ رسول	150	300
تحریکِ پاکستان کے گم گشتہ حقائق	300	*
The Best Of A.S.K. Joommal	*	600
The Pakistan Idea	*	200
Woman - Recreated	*	200
The Bible - Word of God or Word of Man	*	300
The Holy Quran and our Daily Life	*	300

کتابیں ملنے کا پتہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
25 بی، گلبرگ 2، لاہور
فون نمبر: 35764484, 35753666
trust@toluislam.com
www.toluislam.com

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 01720041073503، حبیب بینک لمیٹڈ، مین مارکیٹ گلبرگ برانچ، لاہور۔

ان قیمتوں میں ڈاک خرچ اور پیکنگ کا خرچہ شامل نہیں۔ یہ قیمتیں کسی بھی وقت تبدیل ہوسکتی ہیں۔

بنجر پاکستان میں، باغبانی اور جنگل کاری

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے

☆ 2013ء مری میں باغبانی کی صد سالہ سالگرہ ہے

☆ پاکستان بھر کے باغبانوں، زرعی اداروں، زرعی یونیورسٹیوں اور پورے پاکستان کے محکمہ جنگلات اور محکمہ ماحولیات کے دانشور خواتین وحضرات سے پرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ 2013ء کو

''بنجر پاکستان میں باغبانی اور جنگل کاری'' کے طور پر منائیں اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔

☆ بنجر پاکستان آباد ہوگا

☆ بنجر پاکستان میں باغبانی ہوگی

☆ بنجر پاکستان میں جنگل کاری ہوگی

☆ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے

☆ غربت کے خاتمہ میں مدد ملے گی

☆ ماحولیات کے لئے یہ سال بطور خاص اہمیت حاصل کرے گا

☆ جہاں مری کے باغبان اپنی صد سالہ سالگرہ منائیں گے وہاں پورے پاکستان کا ساتھ دیتے ہوئے 2013ء کو باغبانی اور جنگل کاری کے طور پر منائیں گے

☆ 100 سالہ پودہ جات میں مری کا آملہ۔ دیسی انار۔ ناکھ ناشپاتی۔ اخروٹ۔ ہاڑی۔ شہتوت۔ بٹنگی۔ پھگواڑی اور ریٹھا کے پودے شامل ہیں۔ لاہور چڑیا گھر کا برگد کا درخت سو سالہ ہے۔ دیگر معلومات درکار ہیں۔

پتہ / رابطہ

(1) ملک حنیف وجدانی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیّداں نیو مری

(2) صبینہ یاسمین سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن ٹبی سیّداں سوہاوہ جہلم

(3) تنویر صادق نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن میاں چنوں خانیوال

(4) ڈاکٹر حامد حسین نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن بلاک C ڈیرہ غازی خان

(5) طارق ایم ملک شعبۂ نشتر واشاعت باغبان ایسوسی ایشن چارہان نیو مری

(6) احمد نواز خان تاحیات ممبر باغبان ایسوسی ایشن گاؤں گھماواں نوانشہر ایبٹ آباد

قرآنک فاؤنڈیشن

اشتہار

Surah Al-Muzammil (الْمُزَّمِّلُ) – Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 16[1]

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

The importance of Surah الْمُزَّمِّلُ (Al-Muzammil)

Dear friends! For about fifty years now I have been pondering on the Quran. Believe me! There are some Surahs that whenever they appear in front of me I start shaking in awe due to their splendor and amazing power. If you recall, when Parah 29 of the Quran was about to start, I mentioned that in the last two Parahs (i.e., 29 & 30) especially, there is description of a revolutionary program that was moving ever so slowly and then it started moving faster. Initially, in the life of Mecca, the preparations related to this program were moving slowly. As we will see the Quran mentions that this program was always moving ahead in a perfectly balanced way according to a Divine plan. This was not some ad-hoc or short term program but it was a well-balanced long term strategic program with a final goal in mind. From the very first day the purpose and goal of this Divine program had been communicated to the Prophet (PBUH).

The need for companions

Dear friends! We find from history that the Prophet (PBUH) had addressed his people at the very outset of his mission regarding which he had been commanded by Allah with a message to stand up and overturn the Arab and non-Arab oppressive regimes. He therefore said to his people: I need some companions. Let me know who amongst you will stand with me to shoulder this burden? This was his first address to the people. There was no one even to second his motion. He said: "I am the first among the Muslims" (6:164). This was the first call. And *this* revolutionary message was being proclaimed in the very first call. You read in history that the Koresh opposed this message and fought it tooth and nail. And they did this for the entire life of the

[1] The previous lecture continues with Surah Al-Muzammil after the end of Surah Al-Jinn

Prophet (PBUH) in Mecca. But instead of listening to him they opposed him right away and then they started regular wars with him after he moved to Medina. According to history, in a short span of just seven years they started about 82 small and big wars. They did not stop these wars until Mecca was finally conquered by the Prophet (PBUH) and his companions. The Koresh weren't defeated just like that. They fought extremely hard until the last drop of their blood; they continued the battle until their last person.

Reason for their opposition

What was that which provoked such a violent opposition from the Koresh and why? Was this the matter of the Prophet (PBUH) praying *Namaaz* (*Salaat*) in a different way than the Koresh? But there were people (called *Hanif*) at the time who were also doing similar prayer and the Koresh were not opposed to them? These (*Hanif*) were the people who claimed to follow the path of the Prophet Ibrahim (PBUH). But the Koresh and other Arabs also used to claim to follow the Prophet Ibrahim as well? There were others among them who claimed they did not worship any idols. According to their beliefs they claimed that they worship God alone. The Koresh never had any problems with these *Hanifs*. On the other hand, these *Hanifs* also opposed the Prophet Muhammad (PBUH). So, was this only our Prophet's *Namaaz* that the Koresh were so much opposed to? And the opposition was such that they continuously fought the Prophet for 13 years in Mecca and 7 years in Medina by starting aggressive wars, spilling blood, and killing people. So what was the reason, after all, which provoked them to do all this? Well, it was because the system of *Salaat* of the Prophet (PBUH) which directly challenged the Koresh's system of life based on total injustice. *This* was the main reason. Hence their extreme opposition – so much so that when the Prophet (PBUH) and his companions migrated to Medina, even then these Koresh were not satisfied but carried their fight to Medina as well. Did these Koresh carry their fight to Medina because they wanted to stop the Prophet (PBUH) and his companions from praying their *Namaaz*? Well, was this really the case?

Dear friends! The Koresh knew that not just at their place but at *any* place if the Prophet's system of life gets established then no unjust and wrong system can remain anywhere. What was the basis of the economic, political, and social systems of the Koresh? – And of the Iranian and Roman systems of the time? It is well known that the confrontation and the fight continued throughout the Prophet's life in Medina. How big the power of Koresh was compared to the Prophet (PBUH) and his companions? First, they were migrants in Medina. Second, they did not have any weapons and resources. But these Koresh from Mecca attacked them with all their might shortly after they migrated. These were the conditions which the Prophet (PBUH) and his companions were facing. But the Prophet (PBUH) was writing letters to the kings of Rome, Iran, and Abyssinia. He wrote to them that it has come to our attention that your workers and farmers are being persecuted and repressed. He asked to stop this. Otherwise, he told them to be prepared for a confrontation in order for us to free these repressed people from your bondage. This letter was being written by whom? By a refugee from Medina! Dear friends! *This* was the revolutionary message of the Prophet (PBUH); *this* was showing 100% conviction in one's message!! These letters were being written at a time when it looked as though these asylum seekers would be wiped out by the Koresh. And these letters were being written to the most powerful kings of the time: Caesar of Rome, Cyrus of Iran, and Negus of Abyssinia. These were the most power kingdoms around Arabia at the time. For centuries these were the only two empires; these were the only two civilizations in the world. And they were being told *this* by Prophet Muhammad (PBUH)? Well, to know what happened to the Roman and Iranian empires, just ask history? Whatever the Prophet (PBUH) told them he showed that in reality by his actions—both these empires and their civilizations and their systems were overturned. This *was* the *Salaat* my dear friends! These Koresh knew their final destiny, their final judgment hidden in the revolutionary call of the Prophet's *Salaat*. We are told **قد قامت الصلاۃ** at the time of standing for prayer. Allama Iqbal (1877-1938) has said that how could the naïve Muslims of the present day know what this revolutionary proclamation "Stand for Salaat" (**قد قامت الصلاۃ**) really means?

The Quranic meaning of "Standing for Salaat" (قد قامت الصلاۃ)

When it was proclaimed to the Koresh that this "standing" is for *Salaat* then there were world-shattering clarion calls hidden in this message: their racial superiority would not stay; their commercial enterprise based on slavery would be gone; so would the interest-based economic system of Medina controlled by the Jews. Nothing would remain under this system of *Salaat* – their dictatorship, their rule, their authority and power, and their government. This revolution would overturn their every institution. They knew that if this system based on improving human condition got established anywhere, then there would be no place that would remain unaffected by this revolution. This new system would lift the status of slaves to the level of Koresh. The Koresh knew all this. That was the reason they so vehemently opposed this message. Dear friends! The migration (*hijrat*) meant that this program was entering the second phase of this revolution and that an open call was being issued about it publically.

Details of "Muzammil" according to Tafsirs (Interpretations)

My dear friends! Now the first verse of Surah Al-Muzammil starts here: يَآ أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1). The Prophet (PBUH) is being addressed by Allah. But before I explain what this address means, let me first mention what our Tafsirs, our narrations in Hadith, and our translations say. It is written in them: O you covered in blanket! This is the traditional translation of this verse. O who is covered in blanket! What to say of this!? And then, when this translation got into poets' corner; when this got to Qawwali singers; then do not ask where things went from there? In this thousand-year old *Mulukiyah* – the rule of humans over humans in general, and Muslim kings in particular – it was its deep conspiracy that this Ummah's eyes are never able to see this revolutionary message of the Prophet (PBUH). *Mulukiyah* made sure to make Muslims busy in mystical meditation and robotic rituals.

Position of the Prophet, Revelation, and Mysticism

Leave aside the Sharia. Even an alien concept called *Tasawwuf* (Muslim mysticism)

crept into Islam. Allah told the Prophet about his position that O Prophet! You did not know even a day before that you were going to receive revelation. That is, the Prophet (PBUH) did not know even a moment before that he was going to get Wahi (revelation) let alone making preparation for it; working hard at it; and trying; and making every kind of effort to get it. The Quran says that the Prophet (PBUH) did not have any knowledge as to whether or not he was going to receive *Wahi* (revelation). *Wahi* is a divine knowledge that is sent down to whomever Allah chooses as His messenger. Revelation is a knowledge that is sent *down from above*. It is not something that travels from bottom to top; it is not something that comes *out* from *inside*. It is a divine knowledge that comes *down from above*; it is purely an *objective* knowledge. The Arabic word نَزَلَ "Nuzool" says it all about its reality. But what do the proponents of *Taswwuf*, *Shariat*, and *Tareeqat* say? They say: We know how to get it. Well! Strange things happen when you enter their handcrafted worlds!! Do you know that in *Taswwuf* there are physical exercises after completing which one gets the title of "*Auliya*"? And then there are meditation exercises? I am saying this because I myself have practiced and done of all of this. How this is done? Just have a meager food and little water and sit in a dark cave up to 40 days and nights at a stretch. But in our place there were no caves. So, we used to sit in a dark little room and we used to turn them into caves. Since inside the caves it is completely dark, we used to make our meditation room totally dark by blocking any light filtering through the door by inserting clothes into slits and any openings. The darker the room gets the more light is supposed to shine within the heart of a would-be Sufi, we were told. This is the process by which to be become spiritually advanced through mysticism.

Mysticism (*Tasawwuf*) has the same face – everywhere

Dear friends! Whether it be Christian mysticism, Hindu mysticism, Jewish mysticism, or Muslim mysticism—it is all the same everywhere. It has the same method, the same process, and the same result everywhere: Sitting alone in totally dark solitary confinement and doing meditation and esoteric exercises – completely cut-off and unconcerned with what goes on in the real world. To give this *Tasawwuf* legitimacy – as mysticism and its related rituals are totally alien to Islam – they said

that the Prophet (PBUH) himself used to do these things in the cave Hira near Mecca before being chosen a Prophet. It is commonly accepted that he often used to go the cave Hira with little food and water and he spent up to 40 days and nights there. Once they attributed this to the Prophet (PBUH) it was simple matter to establish the authority for this *alien concept*. What else could he have done in a dark cave except *Tasawwuf*?

Making effort to receive direct knowledge from God

Thus this supposed practice of the Prophet (PBUH) sitting in a meditative state for 40 nights in a dark cave called Hira generated the certificate for latter-day-mystics of Islam. They take this supposed attribution as following the Sunnah of the Prophet (PBUH). What is achieved by doing all this esoteric meditation exercises in a dark cave for nights at a stretch? – The position of great spiritual leadership (called *Auliya*) by acquiring spiritual knowledge. They call this "knowledge from God" (*Ilm-e-Ludunni* in Arabic) – the knowledge that directly comes from God with no human effort. This is the concept promoted by the proponents of *Tasawwuf*. But this is what revelation (*Wahi*) is, although they do not refer to it as *Wahi*; they call it *Ilm-e-Ludunni*. And one has to make the effort for this – meditating in dark cave and going through esoteric exercises to get it, supposedly like the Prophet (PBUH) did. Dear friends! They brought the Prophet down to their level by manufacturing this story – that he used to go to cave to meditate and did all this esoteric meditation exercises; and as a result he got this knowledge from God. This way the Prophet (PBUH) found *Wahi* in the cave. May Allah protect us from the Devil cloaked in sacred garment!

Narrations from hadith about covering with blanket

Dear friends! I was talking about مُزَّمِّلُ "*Muzammil*". We get 2-3 types of narrations from the books of hadith about this. One is that the Koresh gathered together and decided to label Muhammad – May Allah protect – with a bad nickname. They decided not to call him by his real name! They would give him a bad nickname that evokes hatred. "That way when we use it then everyone will know whom we are talking about," they said. Someone said: let's call him "soothsayer"; others

suggested names such as "poet" or "liar". This narration goes on: At this the Prophet (PBUH) felt very sad and depressed and covered himself with blanket and then the Archangel Gabriel came and addressed him: O who is covered with blanket! My dear friends! Don;t laugh. Please cry on the fate of this Ummah!! Dear friends! This is the traditional explanation of الْمُزَّمِّلُ "Al-Muzammil."

Narrations about the very first revelation

There are other narrations (beside the one mentioned above) about the very first *Wahi* (revelation). They go like this: Archangel Gabriel came to Muhammad (PBUH) in the cave (Hira) where he had gone to meditate as usual. Gabriel put a paper in front of him and asked him to read. The Prophet (PBUH) said: I do not know how to read… Please note here: Allah is sending Gabriel with a message but Allah does not know that Muhammad (PBUH) cannot read. May Allah protect us! Neither Allah nor Gabriel knew that Muhammad cannot read? Only after this incident both Allah and Gabriel found out that Muhammad cannot read?! Amazing!! Anyway, Gabriel then embraced him hard and then all the lights went up inside Muhammad and he started reading fast. But then the Prophet (PBUH) got really scared. Much is written about this in the books of hadith. This hadith is also in Bukhari. Coming back to the story…Extreme fear overtook Muhammad (PBUH). The details are written in great fictional style! (Again May Allah protect us!). Anyway, according to these narrations the Prophet (PBUH) ran from the cave and came home shivering and scared, and told his wife (i.e. Ummul Momineen Khadijah) that he was feeling terribly cold. He asked her to put blanket over him. When Allah saw this scene He said: يَآأَيُّهَاالْمُزَّمِّلُ (73:1) – O! You who is covered with blanket! The next Surah is الْمُدَّثِّرُ (Al-Mudaththir) translated exactly the same: O! You who is covered with blanket!

My dear friends! I will come to الْمُدَّثِّرُ later in the next Surah. Right now الْمُزَّمِّلُ is in front of us. But let me first summarize in few words what happened so that this very long story that is given in the books of hadith could become clear to you. When the Prophet (PBUH) told his wife Khadijah about it then she consoled him like this: O my husband! You should not be afraid; you are a very pious person; you sympathize with

the poor; you speak the truth; so, God will not leave you like this in state of fear. You do not know what is happening to you neither do I. She then said: Let us go to my cousin Warqa bin Naufal (a Christian scholar). Please keep in mind that this is being reported in hadith for determining the very status of the Prophet (PBUH) and this is being done through the certificate of a Christian mystic and scholar!… So, Khadijah took him helter-skelter to Warqa bin Naufal. It seems those who manufactured this fiction did not even know what the position and status of a Prophet is. Anyway, after listening to the story Warqa said: Oh! The angel that came to Muhammad is the same one that came to Moses; he is the same one that came to Jesus. Congratulations Khadijah! Your husband is going to be a Prophet. Please note that a Christian mystic is saying this! But, if Warqa knew for sure that Muhammad was going to be a Prophet and it was the same Archangel Gabriel who came to Jesus and, now, had come to Muhammad with God's message – then he should have been the first one to accept Islam! But he never accepted Islam until his end! My dear friends! It is obvious that this sounds like a conspiracy. Please note again! Warqa is congratulating Khadijah, his cousin sister. He is convinced and said so with full conviction that Angel Gabriel came to the Prophet (PBUH); and Khadijah believed Warqa, the Christian scholar and mystic. Both Khadijah and Muhammad believed Warqa's words and based on his words they got convinced that Muhammad has, indeed, been chosen by Allah as his Prophet. What can we say? No wonder, to Muslims, truth has become stranger than fiction! Well! This is written in Bukhari, so Muslims cannot deny it because this book is on the top of the list among the six authentic "true" books of hadith. This is the first hadith of Bukhari and is written in such a great detail that it spans 2-3 pages. To them this is how *Wahi* (revelation) started. This is the interpretation of الْمُزَّمِّلُ and الْمُدَّثِّرُ (Al-Muzammil and Al-Mudaththir): O! You who is covered with blanket!

It is said that if you have to understand the Quran then you can only understand it through hadith. Dear friends! It would become clear after due thought and pondering that the universal message that the Prophet (PBUH) brought was a revolutionary message. And for a revolution one needs companions and one needs to organize them. It is a simple matter to figure this out. This was a great program requiring

revolutionary structural changes in the very foundation of that society and at all levels. This is the first thing to note.

It is clear that the companions (R) had accepted Islam and they were working shoulder-to-shoulder with Prophet (PBUH) in establishing this revolutionary program. It is also clear that to create this kind of group requires education and training of the individuals involved. This could only be done under a leader or a commander. And that, creating harmony and synergy among the companions in this group must be the primary job of the commander. Some scholars have done research from this point of view. My topic is not military system but those who have investigated this topic have come to the conclusion that the Prophet (PBUH) displayed exemplary command in every battlefield. I have also written a lot about this topic. The Prophet (PBUH) served as an excellent commander-in-chief in battlefields. But my dear friends! Before this military expedition there was this first step of forming a team of individuals who will work together in harmony with each other.

The Quranic and lexical meaning of Muzammil

And now, with this rather detailed background, we come to the real meaning of Muzammil. Arabs used to travel on camels in big caravans. The leader of a caravan had to consider many things before embarking on a travel plan. He must ensure that the weight on each camel remains balanced for the entire journey. If the weights on both sides of a camel's back were not balanced properly then one can only imagine what would happen to the camel and the two passengers riding on its back? Obviously, they would not go very far. This was the first thing that needed to be done; and it was a physical thing. But the second thing was that these journeys lasted several months and only two people were on each camel. So, the leader had to take into account other factors besides physical ones. It is clear that these two passengers would talk to each other on this long journey. They would spend lot of time together. The leader of the caravan had to make sure that these two riders had compatible natures, tastes, and personalities. Considering all this, the leader had to choose the

two riders who had perfect harmony in thought and actions. The Arabs used to call such two riders "*Zameel*" of each other and the leader who chose this kind of passengers was called "*Muzammil*" Even today it is the same meaning. I do not know what happened to our interpreters?!

My dear friends! God forbid! Revelation does not come to me. Whatever I have written in my Lughatul Quran I have given authoritative references for it from standard Arabic lexicons. According to these lexicons even today Arabs call these types of friends – as discussed above who are in perfect harmony in thought and character – "*Zameel*". And the leader who is able to put together such companions who work as a team synergistically, such a leader even today is called "*Muzammil*". The process by which this is done is called "*Tazmeel*". This is what the Prophet (PBUH) did when he started his revolutionary program. First, he had to create a party of his supporters and then he had to decide who will stand with whom. Many military brothers are sitting here in this lecture. They would recognize and appreciate what I am taking about. They would know the importance of standing with each other; and what kind of persons they should be so that they could stand shoulder-to-shoulder together? It is a great quality of a commander who can create such a synergistic group of people. This kind of a leader is called "*Muzammil*". This is why Allah addresses the Prophet (PBUH) as: يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1) – O! You who has created such a synergistic group of companions!

Backbreaking program

My dear friends! It seems the revolutionary program started by the Prophet (PBUH) was very daunting, extremely challenging, and it demanded great courage and audacity. This was a backbreaking revolutionary program. Little later in this Surah the Quran says: اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (73:5) – the program that is assigned to you will be very heavy that will break your back. In Surah Al- شْرَحْ (Sharh) it says: (94:2-3) وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ; الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ He lifted from you the burden that had weighed so heavily on your back. Allah slowly helped you create a party of your companions and your heavy burden became light. Dear friends! Did you see that when success came;

when victory was achieved; when barriers and hurdles were overcame – then Allah says how We removed the burden from over you which had broken your back? This was such a difficult program led by the Prophet (PBUH) that it invited a huge confrontation, not just from the Koresh but it was a proclamation of war against all the Arab and non-Arab repressive regimes of the day. And to face this confrontation was this meager and weak but completely synergistic group of his companions enlightened, educated and trained by the Prophet (PBUH). Just think how big that responsibility was on this revolutionary leader, on this commander-in-chief. All day being spent on this program, to carry out this mission: اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا – True, there is for you by day prolonged occupation with important duties (73:7).

Dear friends! Now سَبۡحً has become to mean rosary called *Tasbeeh*. But the Quran is saying: "since you O Prophet (PBUH), you are so busy in the day tirelessly carrying out difficult and important duties; therefore, you should sleep a little in the night and get some rest." It is obvious that the Prophet (PBUH) was extremely busy putting the program together; and thinking and designing strategies for implementing it. Allah Himself is saying that Prophet (PUBH) was busy in preparing for military expedition in the day and thinking and reviewing it in the night and preparing the agenda for the next day's program. When the mission is so difficult and the responsibility so big then the entire life gets transformed and the person becomes completely engrossed in the mission at hand so much so that he loses all sense of rest and comfort, even forgetting to eat and drink. Eating and drinking are necessary for physical existence but it is also true that when one is so engrossed and deeply passionate about one's mission then one becomes unmindful of eating and drinking in that highly focused state.

Dear friends! Here I want to mention an incident that I witnessed in the 1965 Indo-Pak war and that was reported in Tolu-e-Islam magazine. I went to the frontline of the battlefield near Qusur. I was talking to the soldiers who had won the fight in that war. They stood there nonstop for three days and three nights. They were from district Mianwali. I asked them: You had been standing continuously nonstop for three days and three nights in this battlefield. Did you take some time off for eating and

drinking? One replied: Mian Sahib! Eating and drinking is for those who have time. These food bags and water bottles were there with us all these three days and three nights but who has the time for eating and drinking? I will remember his words for the rest of my life: "Eating and drinking is for those who have time".

Even Allah had to say this

Dear friends! I now understand how grave must have been the situation with the Prophet (PBUH) that Allah had to say this: قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا – Work and keep awake at night but have some sleep as well. This is the proper position of Messenger my dear friends! But do you know how our interpreters interpreted this verse? They said: The Prophet (PBUH) used to pray so much *Nafl* (extra) prayers in the night that his feet used to get swelled. Now think about it. If one had to go to battlefield in the morning would he praying *Nafl* all night that his feet got swelled? What have these interpreters done to the position of the Prophet (PBUH) by these types of interpretations? They did not understand the real position and status of Messenger and Prophet. But how can one understand living in the obscure world of *religion* what the requirements are for the real world of *Deen*? The one who carries the banner of *Deen*, only he knows what all is required of him to do. But the proponents of religion could only understand – when the Quran says سَبۡحًا طَوِيۡلًا – that it means the Prophet (PBUH) used to recite سُبۡحَانَ اللّٰہِ all day using the beads of a long rosary and that he was praying all night. And then you will find detailed stories of Sufis (*Auliyas*). I have presented these stories in Tolu-e-Islam magazine, and in my book "*Taswwuf ki Haqeeqat*". It goes something like this: So and so used pray two thousand counts (raka;a). What would be the total time needed for this? Would it be even possible to pray that many raka'a in a night, someone might ask? Standard answer from the proponents: Well! This is not something to be engaged in calculation! But if that is the case then why did they write this in their books? Because there is no place for using intelligence in this type of sacred things, they would murmur. To question this is Kufr comes the loud answer from them… Anyway, the translation of this verse became: The Prophet (PBUH) used to pray all night and his feet used to get swelled. But Allah says in the Quran that for a revolution like this, it is essential to educate and train people. This

must have required great deal of time and effort on the part of the Prophet (PBUH) and thus even during the nighttime he must have been very busy. The Quran says: نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ; اَوْ زِدْ عَلَيْهِ – OK! You do that but get some time to sleep as well: Half of it,- or a little less, Or a little more. Why? Because: اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا – the next day's agenda is long. Therefore, you are going to be extremely busy in the day working extremely hard all day.

My dear friends! Do you see what kind of harmony is there in these verses? What an enormous program is being assigned to the Prophet (PBUH)? That is: يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1) – O! You who has created such a synergistic group of companions! "After receiving this status of the Prophet (PBUH) your first step is to create a group of companions who will be with you and strive with you shoulder-to-shoulder who have perfect harmony in their personality and character; and who will be passionately driven by synergistic thought and action." Did you now notice the enormous power of these verses and the astonishing impact they create in your mind, my dear friends?! This is what that revolutionary and huge program was which was given to the Prophet (PBUH) to accomplish? After this the Quran says: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (73:4).

The scheduled time is over for this lecture. And وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (73:4) will require much more time to explain. So, we will talk about this in a somewhat relax and tranquil manner in the next lecture. We will only talk my dear friends! People won't understand our explanation as their entire emphasis is on prayer and extra prayer, reciting sacred words on a rosary; and they think that everything will be taken care of after that. This is what they say the Prophet (PBUH) did. How would they know then the real status of the Prophet? As a matter of fact, we have turned reality upside down into fiction.

We completed only three verses of Surah الْمُزَّمِّلُ Al-Muzammil. We will continue with verse 4 in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

ENGLISH PAMPHLETS BY IDARA TOLU-E-ISLAM

Are All Religions Alike	Rs.10
How Sects can be Dissolved?	Rs.10
Islamic Ideology	Rs.10
Man & God	Rs.10
Quranic Constitution in an Islamic State	Rs.10
Quranic Permanent Values	Rs.10
What is Islam?	Rs.10
Why Do We Celebrate Eid?	Rs.10
Why Do We Lack Character?	Rs.10
Why is Islam the Only True Deen?	Rs.10
Woman in the Light of Quran	Rs.10
As-Salaat (Gist)	Rs.25
Economics System of the Holy Quran	Rs.25
Family Planning	Rs.25
Human Fundamental Rights	Rs.25
Is Islam a Failure?	Rs.25
Man & War	Rs.25
Rise and Fall of Nation	Rs.25
Story of Pakistan	Rs.25
The Individual or the State	Rs.25
Unity of Faith	Rs.25
Universal Myths	Rs.25
Who are The Ulema?	Rs.25

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL®AND QUAID-E-AZAM

CPL NO. 28
VOL. 66
ISSUE 9

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 35714546, 35753666 Fax: 35764484
Email: idara@toluislam.com
web: www.toluislam.com

AMBER®

The National Name for International Quality
ISO 9001:2008 Certified



AMBER Range of Products:

Capacitors for Motor Start-Run, Fans, Blowers,
Air Conditioners, Fluorescent Lamps,
High Pressure/High Intensity Discharge Lamps,
and,
Power Factor Correction.

CUSTOMER SPECIFICATIONS ARE WELCOME!!

Amber Capacitors Limited
6K Commercial Model Town, Lahore, PAKISTAN.
Phone: +92 42 3591 6830-5 Fax: +92 42 3591 6836
Email: info@ambercaps.com Web Site: http://www.ambercaps.com/